مع منتخب مقالات، ملفوظات و مواعظ

رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادبِ اسلامی

زیرِ سرپرستی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم

مدیرِ مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادبِ اسلامی (عالمی)
پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

کاروانِ ادب اسلامی

سرپرست اعلیٰ: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (صدر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی))

مجلس مشاورت:

مولانا محمد ناظم ندوی ـــ پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ
پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ ـــ پروفیسر عبدالحلیم ندوی، دہلی
پروفیسر حبیب الحق ندوی، جنوبی افریقہ ـــ پروفیسر ابوالخیر کشفی
پروفیسر ظہور احمد اظہر ـــ پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ ـــ مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔ جے۔ این۔ یو دہلی
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، بی۔ ایچ۔ یو۔ بنارس یونیورسٹی
مولانا نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

معاون انتظامی: اقبال احمد ندوی — کتابت:۔ حامد

معاون طباعت: محمد عفران ندوی — طباعت: لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

زرِ تعاون:

فی شمارہ ـــ چالیس (۴۰) روپے
سالانہ برائے ہندوستان ـــ ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش ـــ تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک ـــ چار سو روپے یا ۱۲ امریکی ڈالر
چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں ـــ RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

پتہ:۔ صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۴	اپریل - جون ۱۹۹۷ء	شمارہ نمبر ۱

۱- منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۵

مقالات

۱- المنقذ من الضلال کی ادبی حیثیت — پروفیسر محمد راشد ندوی — ۸
۲- گلِ رعنا — ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی — ۱۶

شعر و ادب

۱- غزل — قمر سنبھلی — ۲۹
۲- غزل — شیث محمد اسماعیل اعظمی — ۳۰

مقالات مذاکرۂ علمی ملفوظات و مواعظ

* سکریٹری رپورٹ برائے مذاکرۂ علمی ملفوظات و مواعظ — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۳۲
* خطبۂ استقبالیہ — مولانا محمد رضوان القاسمی — ۳۷
* ابتدائیہ — ادارہ — ۴۹

۱۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ان کے ملفوظات و مواعظ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۵۰
۲۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے ملفوظات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرحوم)	۶۰
۳۔ ملفوظات کا اسلوب	ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ندوی	۷۰
۴۔ ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینہ میں	مولانا محمد رضوان القاسمی	۱۰۱
۵۔ اقوال زریں تاریخ و ادب کے آئینہ میں	پروفیسر انیس چشتی	۱۱۳
۶۔ سماجی و ادبی انقلاب میں مواعظ و ملفوظات کا اثر	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۱۲۷
۷۔ ملفوظات	ڈاکٹر اقبال حسین ندوی	۱۳۹
۸۔ حضرت تھانویؒ کے مواعظ کا ادبی مطالعہ	ظفر احمد صدیقی	۱۶۱
۹۔ حضرت مولانا محمد یعقوب مجددیؒ ملفوظات و مواعظ	مولانا سید مشتاق علی ندوی	۱۷۲
۱۰۔ ملفوظات سلیمانی	جمشید احمد ندوی	۲۰۲

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

احساسات کی ترجمانی

انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھے اور اس کے دکھ درد، مسرت وراحت اور احساس وتأثر کو جانے اور یا اس سلسلہ کے اپنے حالات وکیفیات سے دوسرے کو آشنا کرائے، یہ انسان کی صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی خصوصیت بھی ہے اور یہ اس میں فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ اور اسی سے اس کی اجتماعیت، باہمی ہمدردی، دوست ودشمن کو دوست ودشمن سمجھنے کا احساس اور کسی کی مدد کے لیے اپنے میں جذبہ محسوس کرنا وجود میں آتا ہے، انسانی معاشرہ میں ہر زمانہ میں اور ہر طبقہ میں اس بات کا چلن اور رواج رہا ہے اور اسی سے انسان کی سوسائٹی میں تعلق واشتراک کی فضا بنتی ہے۔

اس خصوصیت وکیفیت کا وجود ایک دوسرے کے حالات کا توجہ کے ساتھ مشاہدہ کرنے سے ہوتا ہے لیکن یہ مشاہدہ بڑے پیمانہ پر اور زمینی فاصلوں کی صورت میں اور زمانہ کے فرق سے مشکل سے عمل میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان اپنے الفاظ کے ذریعہ اپنے یا کسی دوسرے کے خیال وتأثر کو دوسرے تک پہنچاتا ہے، یہی کوشش ادب کی صنف کو وجود بخشتی ہے۔

اس طرح ادب انسانی خیال وتأثر کو ایک سے دوسروں تک منتقل کرنے کا بڑا ذریعہ بنتا رہا ہے۔ یہ خیال وتأثر انسان کے کسی بھی مقصد کا ہو ادب اس کو بحسن وخوبی دوسرے کے قلب ودماغ میں منعکس کر دیتا ہے، ادب کی اس خصوصیت وطاقت نے ادب کو محبوب وپسندیدہ موضوع بنا دیا ہے اس کی لذت واثر کو تیز کرنے کا کام بھی مختلف باصلاحیت لوگوں کے ذریعہ

ہوا، اور اس کوشش میں ادب کو بارہا حیا کی پابندیوں سے بھی آزاد کر دیا گیا، بعض وقت اس میں بیباکی معقول حدود سے بھی آگے بڑھ گئی اور بعض لوگوں نے اس بیباکی کو ادب کی اصل خصوصیت سمجھ لی، اور اس کے بغیر وہ ادب کو ادب قرار دینے کے لیے اپنے کو تیار نہیں پائے، ہماری رابطہ ادب اسلامی کی انجمن اسی غلط تصوّر یا غلطی کو محسوس کرانا چاہتی ہے، اس کا کام صرف اس تصوّر کی تردید کا نہیں ہے بلکہ وہ صحیح ادب کو مثبت طریقہ سے بھی پیش کرنا چاہتی ہے، اس کے لیے اس کی تدبیروں میں وہ سالانہ سیمنار ہیں جو صحیح انسانی ادب کے مختلف پہلوؤں کو جو عموماً نظر انداز کیے جاتے رہے ہیں پیش کرتے ہیں اور ان کو واضح اور نمایاں کرنے کے لیے ممتاز ادب شناس اشخاص کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔

اس کی دیگر تدبیروں میں اس انجمن کا سہ ماہی ترجمان کاروان ادب ہے جو منتخب ادبی نمونوں اور مضامین کی اشاعت کے ساتھ اس کے کسی نہ کسی سیمنار کے منتخب مضامین بھی پیش کرتا ہے، اس ترجمان کو شائع ہوتے ہوئے تین سال پورے ہو چکے ہیں اور یہ شمارہ اس کے چوتھے سال کا آغاز کر رہا ہے، ہمیں مسرّت ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کی کوشش اور اس کی آواز نے سفر کی ابتدائی منزلیں ایک حد تک طے کر لی ہیں اور اگلی منزلوں کے لیے اس کا سفر جاری ہے۔ رابطہ ادب اسلامی کے اس سہ ماہی اردو ترجمان سے قبل اس نے ماہانہ عربی ترجمان نکالا تھا۔ جو برصغیر و ممالک مشرقیہ کے اسی دفتر سے کئی سال یہی خدمت انجام دیتا رہا اور جب بلاد عربیہ کے دفتر نے باقاعدہ عربی سہ ماہی ترجمان جاری کیا تو برصغیر و ممالک مشرقیہ کے اس دفتر نے عربی میں اس کو کافی سمجھتے ہوئے اردو میں یہ سہ ماہی ترجمان جاری کیا، اس ترجمان کے بارہ شمارے اب تک نکل چکے ہیں جن میں ادبی نمونوں و مضامین کے ساتھ ۱۲ سیمناروں کے منتخب مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں اب یہ تیرہواں شمارہ اپنے ادبی اصناف کے ساتھ تیرہویں سیمنار کے منتخب مضامین شائع کر رہا ہے، یہ سیمنار ملفوظات و مواعظ کے ادبی پہلو پر حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا، امید ہے کہ اس کے منتخب مضامین اسی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے جس دلچسپی سے اس کے قبل کے مضامین پڑھے گئے تھے۔ بعض مقالات ایسے بھی شامل کیے گئے ہیں جو سیمناروں میں پیش

نہیں ہوئے، سیمینار کے باہر سے ان مقالات کو ان کی اہمیت اور موضوع سے ان کی مناسبت اور افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے شامل کیا گیا ہے۔

ملفوظات و مواعظ کے مؤثر نمونے زیادہ تر صوفیہ کے یہاں ملتے ہیں وہاں ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان صوفیہ کے چاہنے والے اور ان سے محبّت کرنے والے خاصی تعداد میں ہوتے ہیں ان میں اہل علم اور ادب شناس لوگوں کی بھی کچھ نہ کچھ تعداد ہوتی ہے، وہ اپنے ان بزرگوں کے کلام میں ایسی کوئی بات پاتے ہیں تو اس سے ادبی لطف لینے کے ساتھ اس کو اس کی اسی کیفیت کے ساتھ محفوظ کر لیتے ہیں شدہ شدہ اس کی ایک مقدار محفوظ ہو جاتی ہے اور ایسے باذوق نہ ہوں تو بھی ان بزرگوں سے محبت کرنے والے جو ہمہ وقت ان کی رفاقت میں رہتے ہیں ان کے اقوال کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں پھر جب ان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں تو ان اقوال کو ان سے وابستہ اپنے تأثر کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ بہرحال ملفوظات و مواعظ اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے ادب کی ایک صنف بن جاتے ہیں لیکن یہ بات بزرگوں کے ہر طرح کے ملفوظات و مواعظ میں نہیں ہے یہ صرف ان ہی ملفوظات و مواعظ میں ہے جن میں ادب کی رعنائی کے کچھ رنگ آ گئے ہوں، رابطہ ادب اسلامی کے "ملفوظات و مواعظ" پر منعقدہ سیمینار میں ایسے ہی نمونوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی ایک نمایاں جھلک اس شمارہ کے قارئین کو سیمینار کے منتخبہ مضامین میں نظر آئے گی۔

پروفیسر محمد راشد ندوی
صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

المنقذ من الضلال کی ادبی حیثیت

حضرات! امام غزالی دنیا کے چند مفکروں اور عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں ان کی زندگی سے لے کر آج تک ریسرچ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے فکر و فن کا دائرہ زمان و مکان کے حدود کو پار کرتا ہوا عالمی اور دائمی ہے، کسی مفکر اور فنکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جن مسائل و مباحث پر وہ قلم اٹھاتا ہے تو اسکی نظر اپنے ماحول اور معاصرین سے آگے بڑھکر ساری انسانیت کے لیے ہوتی ہے کیونکہ انسانی زندگی میں جو مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تقریباً ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں، حالات کے لحاظ سے ان کی ظاہری شکل و صورت بدلتی رہتی ہے۔ ذہنی فکر و اضطراب، سیاسی و معاشرتی کشمکش، اخلاقی گراوٹ، بدحالی نفس پرستی اور مادہ پرستی خود غرضی اور تن پروری ایسی بیماریاں ہیں جو ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ قرآن میں ہے "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا"۔ انبیائے کرام سے لے کر مصلحین و مجددین تک کا یہ کارنامہ رہا ہے کہ وہ نفوس جن پر دنیاداری اور خود غرضی، بداخلاقی اور بدسلوکی غالب اور حاوی ہو جائے ان کو پاک صاف کرے اور ان کے لیے زندگی گذارنے کے وہ طریقے اور اصول مہیا کرے جن پر چل کر ان کی دنیا و آخرت دونوں بہتر ہو سکتی ہیں۔ انسانی فکر میں جو اضطراب اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے وہ اصول و ضوابط ہیں جن کو انھوں نے اپنی عقل و سمجھ کے مطابق پیش کیا۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے اصول

اور طریقہ کار وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ ہوں وقتی اور عارضی ہوتے ہیں اور زمانے کے آثار چڑھاؤ میں اس کی حیثیت کم ہوتی ہے۔ یہ اصول چاہے اس کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں ہوں جیسا کہ فلسفیوں نے پیش کیے۔ چاہے ذہن و فکر کی اصلاح کے لیے ہوں جیسا کہ علماء اخلاقیات نے پیش کیے۔ چاہے معاش و معاشرت کی اصلاح کے لیے ہوں جیسا کہ سماجی مفکروں اور عالموں نے پیش کیے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اصول جس دور میں پیش کیے گئے ہوں جس زمانہ میں مسرض وجود میں آئے ہوں وہ حقائق پر مبنی ہوں اور ان سے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچا ہو لیکن ظاہر ہے کہ ہر فلسفہ و علم کی طاقت ہوتی ہے اور وہ اپنی طاقت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی صرف ظاہری شکلیں باقی رہ جاتی ہیں اور بہت سے لوگوں کی ذہنی کاوشیں اس کی شرح و تفسیر میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا اور انسانی ذہن و فکر اسی طرح ذہنی و فکری پیچیدگیوں اور کشمکشوں میں مبتلا رہے گا۔ قدرت کا یہ بھی نظام ہے کہ جب انسان سیاسی و سماجی ذہنی و فکری کشمکش میں مبتلا ہو اور اس کا دم گھٹنے لگے اس وقت قدرت کی جانب سے ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو ان کے قلق و اضطراب کو کم کرنے کے لیے یا ختم کرنے کے لیے ماضی کے اچھے اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے عقل و فکر کی روشنی میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں اور ان کے بتائے ہوئے اصول ڈوبتے ہوئے انسانوں کے لیے سفینۂ نوح بن جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں کو تاریخ میں کبھی مجدد، کبھی مصلح اور مفکر کا نام دیا جاتا ہے۔ تجدیدی اور فکری رہنمائی عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ اس کا سہرا انھیں نفوس کے سر جاتا ہے جو اپنے زمانہ کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ ماضی کے علم و فکر کا سرمایہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہو اور مستقبل پر ان کی اچھی نظر ہو۔ اسی طرح اگر دیکھا جائے تو دنیا کی تاریخ میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ مل جائیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام غزالی بھی انھیں لوگوں میں شمار ہوتے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔

امام غزالی کی زندگی اور ان کے علمی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو لگتا ہے کہ اس انسان نے کس شوق و ولولہ سے ماضی کے انسانی علوم کا مطالعہ کیا اور اپنے زمانے کے حالات کا کس طرح

جائزہ لیا۔ اور لوگوں کی ذہنی فکری اضطراب و کشمکش کا کیا مداوا سوچا اور خود کو ان انسانوں میں بلند و ممتاز کرنے کے لیے کون سے طریقے اپنائے کیونکہ انسانوں کی ذہنی و فکری رہنمائی کے لیے جب تک کوئی مصلح یا مجدد، علم و معرفت، فکر و ثقافت، ادب و فن اور زبان و بیان سے پوری طرح مسلح و مزین نہ ہو تو وہ لوگوں کی رہنمائی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

امام غزالی ۱۰۵۹ء میں طوس میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح انھیں ۵۲ سال کی زندگی نصیب ہوئی اور دیکھا جائے تو یہ عمر بہت کم ہے لیکن دوسری طرف ان کے اعمال اور کارناموں کو دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کارآمد رہا ہے اور وہ دن و مہینہ کے حساب سے نہیں بلکہ منٹ اور گھنٹوں کے حساب سے علمی سرمایہ چھوڑتے رہے ہیں۔ ان کی بنیادی تعلیم ان کے زمانے کے لحاظ سے قرآن و حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی ہوئی۔ پھر وہ نیشاپور آئے جہاں امام الحرمین موجود تھے اور انھیں کی صحبت میں انھوں نے فلسفہ اور تصوف کا مطالعہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ یعنی ۱۰۸۵ء میں جب امام الحرمین کا انتقال ہوا اس وقت غزالی کی عمر ۲۶ سال کی رہی ہوگی اور وہ اس وقت تک بہت سی کتابیں تصنیف کر چکے تھے اور اس وقت سلجوقی وزیر نظام الملک امام غزالی کی علمی و فکری کاوشوں سے واقف ہو چکے تھے کیونکہ ان کی شہرت علمی حلقوں میں ہو چکی تھی اور اسی علمی شہرت کی بنا پر نظام الملک نے مدرسہ نظامیہ میں انھیں استاد مقرر کیا اور وہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں تھا اور ان کا تقرر ۱۰۹۱ء میں ہوا۔ مدرسہ نظامیہ اس وقت دنیا کا سب سے اعلیٰ علمی ادارہ شمار ہوتا تھا اور اس وقت اسکی حیثیت وہی تھی جو اس وقت دنیا کی بڑی جامعات کی ہوتی ہے۔ امام غزالی کی شہرت اس وقت ان کی زبان دانی فقہ و حدیث میں پوری واقفیت اور فلسفہ و منطق میں ہو چکی تھی اور وہ مدرسہ نظامیہ کے ایک کامیاب استاد و مصنف کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس مدرسہ کی شہرت و عزت کی بنا پر امام غزالی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو ظاہر پرست آنکھوں کے لیے انوکھا اور عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ عام طور سے عزت، شہرت و دولت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو ملتی ہیں تو وہ خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے

اور خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور ان نعمتوں کی بقا کے لیے دعا بھی کرتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ نعمتیں امام غزالی کے لیے زحمت بن گئیں اور شہرت کو وہ اپنے لیے مہلک مرض سمجھنے لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ امام غزالی نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کے نشیب و فراز، یونانی فلسفہ کے فوائد اور اس کے نقصانات، متکلمین کی کاوشیں اور ان کے انحرافات، علماء و مقلدین کے اثرات جو اسلامی سوسائٹی پر پڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر سی کتاب "المنقذ من الضلال" میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب صفحات کے لحاظ سے بہت ضخیم نہیں ہے لیکن ایک ایک لفظ میں امام غزالی کے علم و عرفان، ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات، ان کی بے چین روح کی جھلک اور عکس نظر آتا ہے۔ امام غزالی نے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ اپنے زمانے کے علوم و فنون کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ پوری طرح ہضم کر لیا تھا اور اس پر عالمانہ و ناقدانہ بحثیں بھی کی ہیں۔ ان کا علمی اور ادبی ذوق بھی نکھرا ہوا تھا جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو کہیں بھی الجھاؤ اور پیچیدگی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر جب بحث کرتے ہیں تو ان کی اپروچ (APPROACH) عالمانہ اور مجتہدانہ ہوتا ہے اور طریقۂ ادا میں بھی کہیں تکلّف اور تصنّع کی جھلک نظر نہیں آتی۔ فلسفیانہ موضوعات جیسے "تہافت الفلاسفہ" اور "مقاصد الفلاسفہ" میں بھی ان کی زبان عام فلسفہ کی کتابوں سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔
قدرت نے انھیں زبان و بیان کا ایسا ملکہ نصیب فرمایا جو عوام و خواص دونوں کے لیے قابل قبول تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ ایسا ملکہ تھا جس کے ذریعہ سے وہ عوام و خواص دونوں کے دلوں میں اتر جاتے اور جادو کا اثر پیدا کر دیتے تو بیجا نہ ہوگا۔ دراصل یہی زبان و بیان کا اعلا معیار ہے جس کو علماء نقد و بلاغت نے سہل ممتنع سے تعبیر کیا ہے جو دیکھنے میں اچھا اور آسان نظر آئے لیکن اس کی نقل و تقلید نہ ہو سکے۔ "المنقذ من الضلال" کو امام غزالی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کی سب سے زیادہ اہمیت اس لیے اور ہے کہ امام غزالی نے اس کو "احیاء العلوم" کی تصنیف سے فارغ ہو کر مرتب کیا تھا۔ "الاحیاء" میں امام غزالی کی زبان پوری طرح سے نکھر چکی تھی۔ اور کہیں کہیں

انھوں نے بعض مباحث کو وجد و کیف کے عالم میں مرتب کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا ہر ہر لفظ اور جملہ دلوں کو دہلا دیتا تھا اور پڑھنے والے کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں "الاحیاء" میں خطیبانہ اور واعظانہ رنگ بھی نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مباحث اس طرز ادا کے متقاضی تھے۔ "المنقذ من الضلال" میں ان کا قلم پوری طرح سے منجھا ہوا نظر آتا ہے اور اپنی کہانی اپنی زبانی جب بیان کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ مخاطب کے عقل و قلب دونوں کو ایک ساتھ موہ لیں گے۔ اس طرح یہ کتاب حسین و جمیل زبان و بیان کا ایک مرقع ہے۔ امام غزالی ۱۰۹۱ء سے لیکر ۱۰۹۵ء تک مدرسہ نظامیہ بغداد میں ایک کامیاب استاذ اور مصنف کی حیثیت سے رہے۔ ان چار سالوں میں جس تیزی سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا حیرت انگیز ہے۔ اس عرصہ میں امام غزالی دنیائے اسلام میں ایک کامیاب مصنف اور اعلیٰ درجے کے فلسفی کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔ اُن کی شہرت اور انکی عظمت کا اندلس سے لیکر خراسان تک کے لوگوں نے اعتراف کیا اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب عجوبہ ہے کہ ان کی عالمی شہرت نے ان کے دل کو بے چین کر دیا۔ اور انھیں یہ شبہ ہوا کہ وہ شہرت کے خواہاں ہیں یا شہرت انکی منزل ہے۔ اس شک نے انھیں بغداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ عیش و عشرت، عزّت و شہرت کی زندگی کو خیرباد کہہ کر مشقت و گمنامی کی زندگی گذارنے کی طرف بڑھے۔ امام غزالی کے اس اقدام سے آج بھی لوگ حیرت کرتے ہیں اور خود ان کے زمانے کے لوگوں نے بھی حیرت کی کیونکہ کسی کو اس بات پر یقین نہیں ہو سکتا۔ اگر اس حادثہ کو امام غزالی اپنی کتاب اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَال میں قلم بند نہ کرتے تو لوگ اس کو افسانہ سمجھتے۔ امام غزالی نے بغداد کیسے چھوڑا، کس حالت میں چھوڑا۔ پوری داستان ان کی کتاب میں موجود ہے۔ پھر بغداد چھوڑنے کے بعد مختلف علاقوں میں دربدر پھرتے، راستہ کی صعوبتوں کو برداشت کرتے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور جہاں بھی انھیں علم و عرفان کی روشنی نظر آتی حق و صداقت کی کہیں بھی جھلک محسوس کرتے۔ وہی ان کی منزل ہوتی۔ "اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَال" کے مطالعہ سے جہاں امام غزالی کی علمی و فکری

کاوشیں سمجھ میں آتی ہیں وہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں ایک بے چین و مضطرب روح عطا فرمائی تھی اور ان کے مزاج میں غیر معمولی شوخی تھی جس کی وجہ سے وہ مشقت میں لذت محسوس کرتے۔ جس انداز میں انھوں نے دس سال مختلف علاقوں کی خاک چھاننے میں گذارے اور جس طرح اس عرصہ کی روئداد اور سرگذشت بیان کی ہے اس کو پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مریض روح ہے، مریض جسم دور سے دیکھنے والے کو ان کے مرض کا پتہ نہیں چلتا لیکن چاہے وہ مرض قلب کا ہو یا جسم کا اسکو وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس میں مبتلا ہے اور وہ طبیب حاذق کی تلاش میں سرگرداں ہے تو حق بجانب ہے۔ اس کو نہ تو ملامت کرنے والے کی ملامت کی فکر ہوتی ہے اور نہ تنقید کرنے والے کی تنقید کی پرواہ بلکہ اس کی منزل کوئی طبیب روحانی تھا یا طبیب جسمانی۔ بغداد سے جب وہ روانہ ہوئے تو دمشق انکی پہلی منزل تھی۔ دمشق اور بغداد ان دونوں بڑے شہروں کے درمیان بہت سی چیزوں میں منافسانہ عنصر پایا جاتا تھا اس لیے امام غزالی نے لوگوں سے دمشق کو اپنی منزل نہیں بتایا بلکہ یہ کہہ کر نکلے کہ وہ سفر حج کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کیفیت کو انھوں نے۔ المنقذ مِنَ الضَّلال میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ثم ارتبک الناس فی الاستنباطات وظن من بعد عن العراق عن ذالک کان لاستشعار من جهة الولادة واما من قرب من الولادة فکان یشاهد الحاحهم فی التعلق بی والانجاب علی واعراضی عنهم وعن الالتفات الی قولهم فیقولون هٰذا امر سماوی ولیس له سبب الا عین اصابت اهل الاسلام و زمرة اهل العلم [1]

جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ امام غزالی کے مزاج میں غیر معمولی شوخی تھی اور اس مزاج کا ہر انسان ریگستان کی مشقت ہو یا پہاڑوں کی پرپیچ راہیں ہنسی خوشی طے کرتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اسے دوسری منزل کی طلب پیدا ہو جاتی ہے اور اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے سمٹ آتی ہے اور وہ اسکو ایک وحدت کی شکل میں دیکھنے لگتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اسکی اندرونی کیفیت میں ایک ایسا آئینہ پیدا ہو جاتا ہے جس میں قدرت کا سارا نظام حسن و جمال کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو انھوں نے المنقذ میں جس طرح بیان کیا ہے وہ

[1] المنقذ من الضلال ص ۱۰۵

پڑھنے کے لائق ہے :-

ولم ازل فی عنفوان شبابی وریعان عمری منذ راهقت البلوغ الی الآن وقد أناف السن علی الخمسین أقتحم لجة هذا البحر العمیق واخوض غمرته خوض الجسور لاخوض الجبان الحذور وأتوغل فی کل مظلمة واتهجم علی کل مشکلة واتقحم کل ورطة واتفحص عن عقیدة کل فرقة واستکشف اسرار مذهب کل طائفة لأمیز بین محق ومبطل ومتسنن ومبتدع، لا اغادر باطنیًا الا واحب ان اطلع علی باطنیته ولا ظاهریا الا واریدان اعلم حاصل ظاهریته ولا فلسفیًا الا واقصد الوقوف علی کنه فلسفته ولا متکلما الا واجتهد فی الاطلاع علی غایة کلامه ومجادلته ولا صوفیًا الا واحرص علی العثور علی سر صوفیته ولا متعبدًا الا واترصد ما یرجع الیه حاصل عبادته ولا زندیقًا معطلًا الا اتجسس وراءه للتنبه لاسباب جرأته فی تعطیله وزندقته۔

وکان التعطش الی درک حقائق الامور دأبی ودیدنی من اول امری وریعان عمری غریزة وفطرة من الله وضعتا فی جبلتی لا باختیاری وحیلتی حتی انحلت عنی رابطة التقلید،،[1]

ماضی کے علمی تجربوں اور متکلمین و فلسفیوں کے ذہنی اضطراب اور حقائق سے فرار کو انھوں نے جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے ان کی اپنی ذاتی اپروچ (APPROACH) اور متکلمین و فلسفیوں کی بے بضاعتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"لم یکن فی کتب المتکلمین من کلامهم حیث اشتغلوا بالرد علیهم الا کلمات معقدة مبددة، ظاهرة التناقض والفساد، لا یظن الاغترار بها فی عاقل عامی فضلًا عمن یدعی دقائق العلوم فعلمت ان رد المذهب قبل فهمه والاطلاع علی کنهه رمی فی عمایة فشمرت عن ساق الجد فی تحصیل ذالک العلم من الکتب بمجرد المطالعة من غیر استعانة باستاذ واقبلت علی ذالک فی اوقات فراغی من التصنیف والتدریس فی العلوم الشرعیة وانا ممنو بالتدریس والافادة لثلاث مأة نفر من الطلبة ببغداد، فأطلعنی الله سبحانه وتعالی بمجرد المطالعة فی هذه الاوقات المختلفة علی منتهی علومهم

---

[1] المنقذ من الضلال / ۶۲ - ۶۳

فی اقل سنتین ثم لم ازل اواظب علی التفکیر فیہ بعد فہم قریباً من سنۃ اعاودہ واُردّدہ، و اُتفقد غوائلہ واُغوارہ حتی اطلعت علی ما فیہ من خداع وتلبیس وتحقیق وتخییل اطلاعاً لم اُتشک فیہ،، [۱]

امام غزالی نے اس کتاب کو صحیح معنی میں اپنی زندگی کے علمی وفکری اور اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا مرکز ومحور بنایا ہے اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد امام غزالی کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے، ذاتی سیرت نگاری کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہ تاثرات اور حقائق آئینہ کی طرح کتاب کی ایک ایک سطر میں جلوہ گر ہوں. اس لیے اگر خود نوشت سوانح میں مصنّف نے کہیں بھی اپنی زندگی کے کسی مرحلہ کے بیان میں ہیرا پھیری کی یا بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب تصنیف وتالیف کے لحاظ سے اعلا مقام حاصل کرلے لیکن فن خود نوشت میں اس کو کوئی مقام حاصل نہ ہوگا۔

آج فن خود نوشت دنیا کی تمام زبانوں میں ایک اعلا فن کی حیثیت سے وجود میں آچکا ہے اور ہر زبان میں اس فن پر جو کتابیں چھپ کر آئی ہیں ان سے اس فن کی اہمیت اور ان کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے. اس لیے اس فن پر زیادہ تر وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے فکر وفن میں کوئی تعقید نہ ہو اور جو پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل خواہ وہ علمی ہوں یا سیاسی، سماجی ہوں یا مذہبی، ان کو اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ وہ مسئلہ نہیں رہ جاتے اور یہ چیز ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے خیال میں بلندی اور فکر میں پختگی اور قلم میں رعنائی اور شگفتگی ہوتی ہے. اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو " المنقذ من الضلال " کی عظمت اور اہمیت صرف عربی زبان میں نہیں بلکہ اس کو عالمی ادب میں بھی اعلا مقام دیا جا سکتا ہے۔

⁂

---

[۱] المنقذ من الضلال / ۷۴ - ۷۵

ڈاکٹر محسن عثمانی

گلِ رعنا

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبِ کتاب "گلِ رعنا" کا سلسلۂ پدری امام حسنؓ پر منتہی ہوتا ہے، ان کا خاندان "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے، ان کے بزرگوں میں حضرت سید شاہ علم اللہ، حضرت سید آدم بنوری کے جلیل القدر خلیفہ تھے، آپ کے دادا مولانا سید عبدالعلی ایک مرد درویش اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید اور مجاز تھے۔ آپ کے والد مولوی حکیم سید فخرالدین عالم جلیل اور خوش فکر شاعر تھے، انھوں نے تصنیفات کا ایک دفتر چھوڑا جس کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔

باقیات الصالحات میں ان کی ضخیم اور قیمتی کتاب "مہر جہانتاب" ہے جو گنجینۂ علوم و معارف ہے اور ان کا ایک دیوان ہے جو ان کی شعری مہارت اور صلاحیت کا ثبوت ہے صاحبِ گلِ رعنا نے اپنی کتاب کے آخر میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

مولانا سید حکیم عبدالحی حسنی اپنے والد کی خصوصیات کے وارث اور نسبی فرزند ہونے کے ساتھ ان کے معنوی فرزند تھے۔ ادب و انشاء کا ذوق، نقد سخن، احساس جمال اور درویشی اور خدا ترسی کے اوصاف ان کو اپنے خاندان سے وراثت میں ملے تھے، وہ طبیب حاذق بھی تھے اور تصنیف و تالیف کے میدان کے مرد بھی۔ خلوت پسندی اور یکسوئی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور ملی خدمت کے میدان کے شہسوار تھے۔ ندوۃ العلماء کی علمی اور دینی تحریک کے وہ سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ ان کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوئی۔ خاندان کے بزرگ مولانا سید عبدالسلام ہسوی اور سید شاہ ضیاء النبی کے زیر سایہ عہد طفلی گزرا۔ اول الذکر سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے کمالات کے امین تھے اور مؤخر الذکر کا شمار اولیاء مقبولین میں ہوتا ہے۔

ان کی مبارک اور پرنور مجلسوں ہی میں بیٹھنے کی وجہ سے دین اور اہل دین کی عظمت لوح قلب پہ نقش ہوگئی، اور لکھنؤ بھوپال میں حدیث وادب کے مستند اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا عبدالحی کی طبیعت میں تنوع رنگارنگی، جامعیت اور اعتدال کا وصف پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں دودمان ولی اللّٰہی کا یہ امتیاز ہے۔ شریعت وطریقت، تصنیف وتالیف اور رہبری وقیادت یہ اوصاف جو دوسروں کے یہاں الگ الگ پائے جاتے ہیں اس خاندان کے لوگوں میں اکثر جمع ہوجاتے ہیں۔ یہی وصف مولانا عبدالحی صاحب کا بھی جوہر امتیاز ہے، وہ محدّث بھی ہیں اور فقیہہ بھی، سوانح نگار بھی اور مؤرخ بھی، اور ادیب اور ناقد سخن شناس بھی، وہ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ تصانیف کی فہرست میں جو کتاب ان کی شہرتِ تام اور بقائے دوام کا سبب بنی وہ "نزہتہ الخواطر" ہے، جو ہندوستان میں قرن اوّل سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک مسلمانوں کی علمی اور دینی شخصیتوں کا تذکرہ ہے، یہ آٹھ جلدوں کی "انسائیکلو پیڈیا" ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے اور جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے یہ کتاب ایک پورے کتاب خانے کا حاصل اور نچوڑ ہے۔ مؤرخانہ دیدہ وری اور حسن انتخاب کا وصف اس کتاب میں نمایاں ہے۔ "الثقافۃ الإسلامیہ فی الھند"، اور "الھند فی العھد الاسلامی" ان کی دوسری مقبول عربی کتابیں ہیں۔ ان کی اردو تصنیفات میں "یاد ایّام"، اور "گلِ رعنا" کو شہرت حاصل ہوئی، یاد ایام گجرات کی تاریخ ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ کتاب نہ صرف تاریخ نویسی کا بلکہ ادب وانشاء کا بھی نمونہ بن گئی ہے۔

"گل رعنا"، اردو زبان کے چمنستان کے خوش بیان شاعروں کا تذکرہ ہے اور اردو زبان کی تاریخ ہے۔ یہ دوسری کتاب ہے جو اس ملک میں اردو شعراء کے تذکروں سے متعلق اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔

اس کتاب سے پہلے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اُردو میں "آبِ حیات" کے نام سے شعراء اردو کا تذکرہ لکھا تھا ورنہ اس سے پہلے تذکرہ اُردو شعراء کا ہوتا تھا اور زبان فارسی ہوتی تھی۔ اور اہل علم کے لیے یہی زبان اس زمانہ میں طرۂ افتخار تھی۔ اور علم وادب

کے بازار میں اسی کا سکہ رائج تھا۔

گل رعنا صرف تذکرۃ الشعراء نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لفظ لفظ سے شعور سخن اور نقد سخن آشکارا ہے۔ کتاب میں اس کا ذکر نہیں کہ اس کتاب کا نام "گل رعنا" کیوں رکھا گیا۔ گل رعنا کے نام سے ۱۱۸۱ھ میں ہندوستان کے شعراء فارسی کا ایک تذکرہ "گل رعنا" کے نام سے لکھا گیا تھا جو بہت کمیاب ہے۔ یہ نام اس سے مستعار بھی ہو سکتا ہے اور یہ محض توارد بھی ہو سکتا ہے اس فارسی تذکرہ کا قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتاب خانے میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے، اس کی کتابت ۱۹ جمادی الاول ۱۱۸۶ھ میں ہوئی ہے، یعنی اس کتاب کا سن تصنیف مولانا عبدالحی کی گل رعنا سے ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے۔ فارسی گل رعنا کے مصنف کا نام "رائے لچھمی نارائن کھتری شفیق اورنگ آبادی ہے، جو غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے شفیق تخلص بھی انھیں کا عطا کیا ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے وہ صاحب تخلص کرتے تھے ان کے دادا بھوانی داس لاہور کے کھتری کپور خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پہلی بار اورنگ زیب (۱۰۶۹-۱۱۱۸) کے لشکر میں شامل ہو کر دکن کی سمت گئے تھے اور وہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ لچھمی نارائن شفیق نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ گل رعنا کے علاوہ ان کی کتاب چمنستان شعراء ہے جو اردو شاعروں کے تذکرے پر مشتمل ہے ان کی تیسری کتاب "شام غریباں" ہے۔ اور ان فارسی گو شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو ایرانی الأصل تھے اور ہندوستان بغرض سیاحت آئے تھے ان کی ایک اور کتاب "مآثر آصفی" جو آصف جاہ اوّل اور آصف جاہ ثانی کے عہد کی تاریخ ہے وہ اور بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لچھمی نارائن کی گل رعنا کا پہلا حصّہ سخن طرازانِ اسلامیان پر مشتمل ہے جس میں ۱۲۶ شعراء کا تذکرہ ہے، دوسرا حصّہ نکتہ پردازانِ اصنامیان یعنی ہندو شعراء پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۴۴ ہے۔

جب مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا اور حکومت کی زبان فارسی تھی تو اصنامیان ہند یہ زبان سیکھ رہے تھے اور منصب دار بن رہے تھے وہ لسانی اور تہذیبی اعتبار سے مسلمان ہو گئے تھے ایک خلیج اور باقی تھی یہ بھی پاٹی جا سکتی تھی لیکن اس کے لیے جس درد محبت کی ضرورت

تھی وہ دلوں میں موجود نہ تھا اور جو دعوت دین کا مزاج درکار تھا وہ کمیاب تھا۔

فارسی گل رعنا کے بعد شاہ محمد کمال جو قصبہ کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے فارسی میں تذکرۂ شعراء "مجمع الانتخاب" لکھا، یہ تذکرہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۵ء) میں لکھا گیا۔ اس کا قلمی نسخہ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ قدرت اللہ شوق نے ۱۱۸۹ھ میں فارسی میں "طبقات الشعراء" کے نام سے کتاب لکھی یہ بھی اردو شعراء کا تذکرہ ہے اور بہت کمیاب ہے، فارسی زبان میں شعراء کے کئی تذکرے لکھے گئے، مثال کے طور پر میر تقی میر کی نکات الشعراء، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا گلشن بے خار، تذکرہ میر حسن، تذکرہ فتح شاہ وغیرہ۔ اگر شعراء کے تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے اور دواوین نہ چھپتے تو بہت سے آوارہ گرد اشعار کے حسب ونسب کا پتہ چلانا بھی آج دشوار ہوجاتا۔

شمس العلماء محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" اردو زبان میں پہلا تذکرہ ہے اور علمی وادبی کارنامہ ہے، پہلی بار اردو کی کہانی اردو زبان میں سنائی گئی۔

ادب وشاعری کے ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی اور استاد ذوق کے شاگرد بھی تھے، شعراء وادباء کے وہ صحبت یافتہ تھے اور ادبی محفلوں کے عینی شاہد تھے، اس لیے زبان کے اداشناس اور خود صاحب طرز انشاء پرداز تھے، آب حیات ان کی انشاء کی کلکاریوں کا مرقع اور ان کے اسلوب جمال کا آئینہ ہے۔

قبول خاطر ولطف سخن خدا داد ست

بایں ہمہ حسن نگارش وحسن اسلوب، آب حیات میں صرف ان شعراء کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں پہلے سے فارسی کے تذکرہ نویس لکھتے آئے ہیں، آزاد نے اسے اردو کا دلکش ودیدہ زیب جامہ پہنایا ہے، علاوہ ازیں وہ تاریخی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ اپنے خاص ذوق اور خاص مسلک کی وجہ سے بہت سے شعراء کے ساتھ انھوں نے انصاف نہیں کیا ہے، آب حیات پڑھ کر ان کے انداز بیان کے جمالیاتی حسن کا ہر شخص اعتراف کرے گا لیکن جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے واقف ہوں گے اور خوب ناخوب کی پرکھ رکھتے ہوں گے

ان کو آب حیات کے مضامین سے اختلاف ہوگا۔ کتاب آب حیات ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اس کو جو پذیرائی ملی وہ کم کتابوں کو ملی ہوگی، اس کے ساتھ آب حیات کے مبالغہ آمیز اور غیر معتدل خیالات بھی رواج پا گئے اور اس کے بہت سے مبالغہ آمیز قصّے نوک زبان بن گئے، ضرورت ایسی کتاب کی تھی جو زیادہ جامع مکمل اور زیادہ متوازن ہو اور جس میں "آب حیات" کی ادبی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ غلطیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہو، اور مولانا عبدالحی حسنی کی گل رعنا نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

گل رعنا ۱۳۴۳ھ جنوری ۱۹۱۵ء میں دار المصنفین سے شائع ہوئی، مصنف اودھ کے رہنے والے تھے اور "نزہۃ الخواطر" کی تصنیف کے سلسلے میں انھوں نے شخصیات کے تذکرہ کا مطالعہ کیا تھا اور اہل کمال سے واقف تھے، اس لیے بہت سی شخصیات کے سلسلے میں انھوں نے حواشی میں جو نوٹ لکھے ہیں وہ معلومات افزا ہیں۔

ادب کی تاریخ کے سلسلے میں بھی انھوں نے جو خامہ فرسائی کی ہے وہ قیمتی ہے، آب حیات میں محمد حسین آزاد نے ولی دکنی سے ابتداء کی ہے اور اس کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے لیکن مولانا عبدالحی شعراء کے تذکرہ کو کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں۔ جب دکن اور گجرات میں صوفیاء کرام کی بدولت اس زبان کو عام مقبولیت حاصل ہوئی اور اس میں شعر کہے جانے لگے۔ انھوں نے امیر خسرو، سلاطین شرقی اور سکندر لودھی، بابر، اکبر، جہانگیر اور عالمگیر کے عہد میں زبان کا جو ارتقاء ہوا اور ہندی الفاظ کا چلن عام ہونے لگا اور مخلوط زبان پروان چڑھنے لگی، اس پر مبصرانہ اور مؤرخانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے پھر گجرات میں یہ مخلوط زبان کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے پھر دکن میں فارسی آمیز مخلوط زبان کے پھیلنے اور ربرگ و بار لانے کے اسباب بتائے ہیں اسی ضمن میں گول کنڈہ میں قلی قطب شاہ کی اردو شاعری کا حال لکھا ہے جس کا دیوان سالار جنگ میوزیم اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجہ اور داماد محمد قطب شاہ تاج و تخت کا مالک ہوا، سالار جنگ میوزیم میں اس کا بھی مکمل دیوان موجود ہے، محمد قطب شاہ کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر ہوا، صاحب گل رعنا نے

ان سب کے کلام کے نمونے دیے ہیں۔ بیجاپور کے شعراء کے تذکرہ میں ملا نصرتی کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے، بیجاپور کی تباہی کے بعد اردو شاعری کا مرکز ثقل پھر دکن منتقل ہوگیا اور نانا شاہ کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھتے ہیں:۔

"مقصد اس تحریر کا یہ ہے کہ اردو شاعری کا آغاز بیجاپور یا حیدرآباد سے ہوا مگر بیجاپور کو راس نہیں آئی سر منڈاتے اولے پڑ گئے، حیدرآباد نے کچھ دنوں اس کی پرورش کی اور آخر کار اس کو بھی وہی روز بد دیکھنا پڑا جو بیجاپور دیکھ چکا تھا، حیدرآباد کی تباہی کے بعد ریختہ نے اورنگ آباد میں ان ہی مغلوں کے دامن میں پناہ لی جنھوں نے بیجاپور اور حیدرآباد سے اس کو نکالا تھا، عالمگیر مرحوم کے بعد چند دنوں اِدھر اُدھر آوارہ رہنے کے بعد دلی میں کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور دلی کی آب و ہوا میں پرورش پاکر دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ دوسری چیز جو میرے مذکورہ بیان سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ شمس ولی اللہ (ولی دکنی) کے ظہور سے پہلے اردو میں قصیدہ خوانی اور غزل سرائی شروع ہو چکی تھی اور مثنویاں لکھی جا چکی تھیں، اس لیے اس بات کا افسوس کرنا پڑتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ولی دکنی کو اولیت کا سرتاج پہنایا ہے۔"

آب حیات میں ولی دکنی کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا ہے، گل رعنا کے مصنف کہتے ہیں کہ اس سے سوا سو برس پہلے شاعری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے اور دیوان حیدرآباد میں موجود ہیں۔"

مصنف نے گل رعنا کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا طبقہ متقدمین کے لیے مخصوص ہے اس میں تین دور ہیں پہلا دور شعراء دکن سے پہلے کا ہے، دوسرے دور میں شعراء دکن اور تیسرے میں شعراء دہلی کا بیان ہے۔

دوسرا حصہ متوسطین کے لیے مخصوص ہے اس میں بھی تین دور ہیں پہلا دور میر تقی میر اور سودا اور ان کے عہد کے شعراء کا ہے دوسرا دور مصحفی اور میر حسن اور ان کے زمانے کے شعراء کا ہے

اور تیسرا دور ذوقؔ اور غالبؔ اور ان کے زمانے کے شعراء کا ہے۔

تیسرا حصہ متأخرین کے ساتھ مخصوص ہے اس میں بھی تین دور ہیں۔ پہلا دور ناسخؔ اور آتشؔ اور ان کے معاصر شعراء کا ہے، دوسرا دور امیر مینائی اور داغؔ اور ان کے عہد کے شعراء کا ہے تیسرا دور حالیؔ اور اکبر اور دیگر شعراء کا جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

گلِ رعنا میں ۷۵ کے قریب شعراء کا تذکرہ ہے اور آبِ حیات میں شعراء کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں مومن جیسے مسلم الثبوت شاعر کو بھی نہیں لیا گیا تھا حالانکہ میر ضاحک اور میر خلیق کو بزم میں جگہ دی گئی جن کے اشعار چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، مرزا مظہر جانِ جاناں کو بھی بادلِ نخواستہ جگہ دی گئی۔
مومن خاں مومنؔ کا تذکرہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جب کیا تو ان کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ وہ ارباب کمال اور صف اوّل کے شعراء کی بزم میں بیٹھنے کے لائق نظر نہیں آتے ہیں۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں مرزا مظہر جانِ جاناں کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی نازک مزاجی کا کھینچا گیا ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب "مرجع خلائق" تھے اور ان کی شخصیت ہر حلقہ میں مسلم اور محترم تھی۔ گلِ رعنا میں مرزا مظہر جانِ جاناں کو ان کے مرتبہ ومقام کے مطابق جگہ دی گئی ہے یہ فرق دونوں مصنفین کی طبیعت اور سرشت کا ہے ایک کا مزاج اہلِ دین کا مزاج ہے اور دوسرے کے مزاج میں حزنیت اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں ہیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی لوح تربت سے آب حیات کے مصنف کے نام آواز آج بھی آرہی ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

آزاد کے ذوق ومسلک کا اظہار مصنف آبِ حیات کے قلم سے مصحفی اور انشاء کے تقابل میں بھی ہو جاتا ہے اور یہی ذوق ہے جو انشاء کو مصحفی پر ترجیح دیتا ہے اور مصحفی کو کم تر

ثابت کرتا ہے لیکن زمانہ خود بہت منصف جو ہری ہے آگے چل کر آزاد کے تبصروں اور آب حیات کی مقبولیت کے باوجود مصحفی کا کلام اہل نظر کی نگاہ میں زیادہ معتبر اور موقر ٹھہرا اور انشاء کی بزم آرائیاں اور ہنگامہ خیزیاں ان کے ساتھ چلی گئیں، گل رعنا کے مصنف نے اس بارے میں منصفانہ موقف اختیار کیا ہے اور اس طرح آب حیات کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجھے اس تنقید سے اتفاق نہیں کہ آب حیات کے بعد گل رعنا لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

صاحب گل رعنا کی ادب کے مراجع اور مآخذ پہ نظر آزاد کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور عمیق ہے، میر تقی کی "نکات الشعراء" اور بعض دوسری کتابوں کے حوالہ سے آزاد نے بہت سی باتیں لکھی ہیں جو خلاف واقعہ ہیں اور جن کتابوں کے حوالے آزاد نے دیے ان میں وہ باتیں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، بات یہ ہے کہ آزاد کا تو سن فکر ہوا سے باتیں کرتا ہے اور ہوائیاں اڑاتا ہے، اور ان کا پرواز تخیل اتنا بلند ہے کہ تاریخیت اور قطعیت کو خاطر میں نہیں لاتا ہے۔

مثال کے طور پر تذکرہ مصحفی کے حوالہ سے اشرف علی خان فغاں کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ وہ قزلباش کے شاگرد تھے حالانکہ مصحفی نے کہیں نہیں لکھا کہ وہ قزلباش کے شاگرد تھے ہاں یہ لکھا ہے کہ وہ ندیم کے شاگرد تھے اور ثبوت کے طور پر خود ان کا شعر پیش کیا ہے۔

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں
دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہوئے گا

تاریخ کی غلط بیانی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آزاد نے لکھا ہے کہ میر صاحب نے اپنی کتاب "نکات الشعراء" کے دیباچہ میں بقلم خود درج کیا کہ "اردو کا یہ پہلا تذکرہ ہے اس پر ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو پھر آزاد آگے لکھتے ہیں کہ ایک ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا پھر مزید "نکات الشعراء" کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ ولی جو کہ بنی نوع شعراء کا باوا آدم ہے اس کے

حق میں میر تقی میر نے یہ لکھ دیا ہے کہ "وہ شاعرے بست از شیطان مشہور تر"، آزاد کے اس فرمانے پر تنقید کرتے ہوئے صاحب گل رعنا کہتے ہیں کہ نکات الشعراء چھپ گیا ہے اور پیش نظر ہے لیکن اس کے دیباچہ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا نام نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشاں ہو ولی کی نسبت نکات الشعراء کے حوالہ سے جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل نہیں ہے اور اس کی جگہ پر یہ ضرور لکھا ہوا ہے کہ "از کمال شہرت احتیاج تو لف نہ دارد"، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اسی لیے کہا ہے کہ آب حیات میں محمد حسین آزاد نے قیاس کی بلند پروازی کے طوطے بنا بنا کر اڑائے ہیں۔

گل رعنا کے مصنف نے جا بجا تاریخی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے آب حیات کا مطالعہ ناتمام رہے گا اگر قاری اس کے بعد گل رعنا نہ پڑھے، اس طرح سے صاحب گل رعنا نے شعراء کی بزم میں بہت سے ایسے اہل کمال کو جگہ دی ہے جن کا نام بھی آب حیات میں موجود نہیں ہے ان کے اشعار ان کی فنی پختگی اور مہارت فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن کوئی بھی تذکرہ ایسا نہیں ہے کہ وہ اتنا مکمل ہو کہ اس کے بعد کسی شاعر کے اضافہ کی گنجائش اس میں موجود نہ ہو بہت سے شعراء خلوت نشین، گوشہ گیر اور شہرت و ناموری سے دور تھے ان کے مقام اور کلام کا علم بھی لوگوں کو نہ ہو سکا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں خود مولانا عبدالحی صاحب گل رعنا کو بحیثیت شاعر کسی نے نہیں جانا صاحب گل رعنا نے اپنے والد مولانا فخر الدین کا تذکرہ بحاطور پر اپنی کتاب میں کیا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے اور بابائے اردو عبدالحق نے ان کو فارسی اور اردو کا اچھا شاعر بھی تسلیم کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ خود اپنا ذکر اپنے قلم سے نہیں کر سکتے تھے لیکن اس چمن کے گل سرسبد مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے بھی حیات عبدالحی میں ان کی شاعری کا اور اس میدان میں ان کے جوہر کمال کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جواہر حال ہی میں ندوۃ العلماء کی لائبریری کے بوسیدہ قلمی کتابوں کے سمندر میں غواصی کر کے

نکالے گئے ہیں اور پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ۱۴ (چودہ) سال کی عمر میں انھوں نے ایک مثنوی سوزِ عشق کے نام سے لکھی تھی۔ حمد، نعت اور منقبت سے جس کی ابتدا ہوتی ہے، چار سو اشعار کی مثنوی میں جو پختگی اور شگفتگی ہے اور اپنے بلند پایہ مربی ماموں عبد السلام کے انتقال کے سوزِ غم کے لیے مثنوی کا جو پیرایہ اظہار انھوں نے اختیار کیا ہے اور جس نو عمری اور کم سنی کے زمانے میں کہا ہے وہ ورطۂ حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی ہے۔

۲ رفروری ۱۹۲۳ء کو مولانا عبد الحی کا انتقال ہوا اور ان کی مثنوی کا علم اب مارچ، ۱۹۹۶ء میں جاکر ہو سکا، سائنس کی کتابوں میں پڑھتے آئے تھے کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی ایک لاکھ ۲۶ ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار کے باوجود آج تک زمین تک نہیں پہنچ سکی اس سائنسی حقیقت کا اس سے بڑا شاعرانہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

ایک دوسری مثال کمال علی کمال عظیم آبادی کی ہے جن کا شمار کچھ دنوں پہلے تک رگ تاک کے بادہ ناخوردہ میں تھا وہ درویش صفت اور دیورہ ضلع گیا کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ ایران کے مشہور شاعر علی حزیں کی ان سے عظیم آباد میں ملاقات ہو چکی ہے صاحب گل رعنا نے اپنی کتاب میں اس ایرانی شاعر کا ذکر کیا ہے۔

"شیخ حزیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ایک بار دلی میں لب سڑک ایک کوٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر اس سڑک سے گزرے شیخ علی حزیں نے دیکھ کر پوچھا "ایں کدام جواں است" سامع ایک شاعر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا "مرزا مظہر جان جاناں، شیخ نے کہا چشم بد دور ہمہ دانی و ہمہ جانی"

کمال علی کمال (متوفی ۱۲۱۵ھ) مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہم عصر تھے اور عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ایران کا یہ فارسی شاعر عظیم آباد پہونچا حضرت کمال کا بہ عنفوان شباب

تھا وہ چند شعراء کے ساتھ حزیں سے ملنے پہونچے، حزیں سے بولنے تمکنت بہت تھی اور جیسا کہ صاحب گل رعنا نے لکھا ہے کہ وہ کسی ہندوستانی کو خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ حزیں نے نہ تو توجہ کی اور نہ سلام کا جواب دیا، کمال علی کمال نے صف بندی کا حکم دیا اور نماز جنازہ پڑھادی بعد میں حزیں نے پوچھا "ایں چہ کردی"؟ انھوں نے جواب دیا من سفت سلام پیش کردم تو جواب ندادی دانستم کہ مردہ ہستی فرض گزاردم" ان کی اس ظرافت اور تیزئ طبع سے متأثر ہو کر اس نے علمی و ادبی خدمات پر گفتگو کی۔

حضرت کمال علی نے حضرت غلام الملک شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے مقولے "خاک شو گمنام شعر" پر عمل پیرا رہ کر بوریہ نشینی اور اللہ کی مخلوق کی ہدایت و اصلاح کی مسند نشینی کی زندگی گزاری، وہ دیورہ ضلع گیا کی خانقاہ ہی میں رہے یہی بستی ان کی قیام گاہ اور آخری آرام گاہ ہے۔ ان کا تذکرہ پروفیسر کلیم الدین نے اپنی کتاب دو تذکرہ میں کیا ہے نیز کلیم سید احمد اللہ ندوی نے تذکرہ شعراء بہار میں اور قاضی عبدالودود نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ان کی تصنیفات مخطوط کی شکل میں دیورہ کی خانقاہ میں ہیں جن کی فہرست یہ ہے۔

منہاج الواصلین، فاتح الانشاء، دیوان فارسی اول و دوم، دیوان اردو، مثنوی فارسی، مثنوی اُردو۔

ان کا دور وہ ہے جب میر سودا کی شاعری کی مسند بچھائی جارہی تھی اور غالب و ذوق و مومن کے نیر اقبال کے طلوع ہونے میں نصف صدی باقی تھی ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

الٰہی حمد تیری کب بیاں ہو — اگرچہ مو تمو تن پہ زباں ہو
الٰہی شعلہ کر چاک سیہ کو — گرا اس گاہ پر برق نگہ کو
الٰہی فضل دل سے رنگ بستہ — کلید قفل سے کردے شکستہ
الٰہی دل کو نازک اس قدر کر — کہ موج بوئے گل ہو تیغ اس پر
الٰہی غم سے دل بے تاب کردے — گداز عشق سے سیماب کردے
الٰہی معرفت اپنی عطا کر — الٰہی میری حاجت روا کر

جہاں کے لوح سے دھودے مرا نام رہے دل پہ مرے نقشیں تیرا نام
فدائے عشق کر اس ناتواں کو ہمالے جائے میرے استخواں کو
گریباں چاک ہو دست جنوں سے مثالِ گل ہو رنگیں جامہ خوں سے

آخر میں آب حیات اور گل رعنا دونوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد اردو زبان کی شاعری اور اس کے پورے عہد کے بارے میں جو تأثر قائم ہوتا ہے اس کا بیان بھی ضروری ہے، ولی دکنی سے لے کر غالب تک کا کلام پڑھ جایئے، تصوف و معرفت کے اشعار کو مستثنیٰ کر کے شاعری کا یہ پورا دفتر بے معنی معلوم ہوتا ہے ہر طرف رخسار و کاکل کا تذکرہ ہے طوق و سلاسل کا تذکرہ نہیں ہر جگہ حسن و عشق کے معاملات اور اس کے ولولے ہیں نہ قید و بند کے مرحلے ہیں اور نہ انقلابات کے حوصلے ہیں۔ ادب تنقید حیات کا نام ہے لیکن ادب کی اہم ترین صنف شاعری اس عہد میں تفریح طبع کے لیے یا امراء سے انعام لینے کے لیے یا ہم چشموں میں تحسین و آفریں کے لیے ہوا کرتی تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سکندر لودھی کے زمانے میں کائستوں کو اتنا شعور تھا کہ ان کو فارسی میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے تاکہ منصب دار حکومت میں عہدہ دار بن سکیں انگریزوں میں اتنا شعور تھا کہ انھوں نے سمجھا کہ جس ملک پہ حکومت کرنی ہے وہاں کی زبان سیکھنی ضروری ہے چنانچہ جان گلگرسٹ نے قواعد اردو ترتیب دی لیکن مسلمانوں کو اتنا شعور نہیں تھا کہ وہ سمجھیں کہ جن علوم کی بدولت فاتح یورپ ساری دنیا میں ظفریاب ہو رہا ہے ان کو سیکھیں اور ان میں امامت کا درجہ حاصل کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ قوم ترقی اور ہنرمندی کی خصوصیات سے عاری ہو چکی ہے اور اس پر غفلت کی نیند طاری ہو چکی ہے، قوائے عمل مضمحل ہو چکے ہیں دماغی آرائشوں کے عیش خانے تعمیر کیے جا رہے ہیں ہر شاعر عیش کوشیوں اور لذتوں کا طبل ہر ہنگام اور غفلتوں اور بے ہوشیوں کا جہاں نما جام بنا ہوا ہے، حکومت و سلطنت پہ خزاں طاری ہے لیکن مضامین نو بہ نو کے پھول شاعری کے چمن میں اپنی بہار دکھا رہے ہیں، امراء کے درباروں میں شعری ذوق کا چمن شبنم تعریف پاکر لہلہا اٹھتا ہے، خزانۂ عامرہ خالی ہو چکا ہے لیکن خوش فکر شعراء نقد سخن لٹا رہے

ہیں اور گردش ایام کی کدورتوں کو جام و سبو میں رکھ کر پی جانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، ملک اگر ہاتھ سے گیا تو گیا ملک سخن باقی ہے اور شعراء اس کے تاجدار ہیں۔ گوہر سلطنت کھو گیا تو کیا ہوا، اشعار کے گوہر شاہوار تو بنائے جا سکتے ہیں اگر چمن میں آگ لگ گئی ہے تو ان کے خیال میں اس آگ کو آب دار شعروں سے بجھایا جا سکتا ہے۔ وہی مضامین عاشقانہ اور وہی میخواری مستانہ وہی خیال آرائیاں اور وہی الفاظ کی کرتب بازیاں وہی عیش و عشرت کی داستانیں اور وہی گل و بلبل کی حکایتیں۔ صاحب گل رعنا نے دھیمے لہجے میں سہی لیکن شاعری کے اس مزاج پر تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اسی نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کر کے چھوڑا ہے یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے اس کو چمنستان خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔" (گل رعنا ص ۳۵۶)

آب حیات کے برخلاف گل رعنا میں حالی، اکبر اور اسماعیل میرٹھی کا بھی تذکرہ ہے، اس نئے عہد سے شاعری کا لہجہ بدلنا شروع ہو گیا تھا، عہد خزاں کا درد حالی کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے گوش نصیحت نیوش کو اپنی شاعری کے واسطے سے اخلاقی تعلیمات کا بھی درس دیا اکبر نے ظرافت کے پردہ میں معاشرہ کے بگاڑ پر احتجاج کیا۔ گل رعنا جدید عہد کے ان شاعروں کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے، اس عہد کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اپنی شاعری کے قلم سے تازیانہ کا کام لیا لیکن ادب کے بوسیدہ بت کدہ کو توڑنے اور جہاں تازہ آباد کرنے کا کام اقبال نے کیا۔ شعر کے ذریعہ تحسین فکر اور تہذیب طبع کا سہرا ان کے سر جاتا ہے وہ کہتے ہیں۔

شاعر دلنواز بھی اگر بات کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

قمر سنبھلی

غزل

سرخرو مجھ کو سدا میرے خدا نے رکھا
ہر قدم سایہ بزرگوں کی دعا نے رکھا

میری آواز کو محفوظ خلا نے رکھا
دیر تک محوِ خود اپنی ہی نوا نے رکھا

سخت جانی پہ دیئے کی تمہیں حیرانی کیوں
خود اسے اپنی حفاظت میں ہوا نے رکھا

میرے حق میں ہوئی دیوار مری خودداری
نہ کہیں کا بھی مجھے میری انا نے رکھا

لاکھ چاہا نہ خراشیں ہوں بدن کی ظاہر
منفعل مجھ کو مگر چاکِ قبا نے رکھا

آگہی میری، مرے واسطے قاتل ٹھہری
بے سکوں مجھ کو مرے ذہنِ رسا نے رکھا

اپنے آگے نظر آتا نہیں کوئی ان کو
چور نشہ میں سدا جھوٹی انا نے رکھا

گل نہ ہو پایا کسی طور محبت کا چراغ
اپنی نظروں میں اسے لاکھ ہوا نے رکھا

بخششیں مجھ پہ نہ کیا کیا ہیں تری یارب
اٹھے ہاتھوں کا بھرم تیری عطا نے رکھا

کتنی پرکیف قمر اپنی ہی آواز لگی!
مجھ کو باندھے ہوئے گنبد کی صدا نے رکھا

جناب شیث محمد اسماعیل اعظمی

قحط الرجال

اب یہ عالم ہے کوئی منزل نہ کوئی راہبر
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اور بر موک و فرات و دجلہ سب ہیں بے صدف
شام و نجد و قیرواں سب ہیں نخیل بے ثمر

سب کے ہاتھوں میں ہے کشکول گدائی صف بصف
اور سب محتاج سیم و زر، سبھی دریوزہ گر

کتنی دہلیزوں پہ پیشانی رہے گی سجدہ ریز
کتنے قدموں پر گرائی جائے گی دستار سر

محو خواب خود فراموشی ہے ہر اک انجمن
ہر سبو دامن تہی، ہر خاکداں ہے بے شرر

رنج پسپائی سے وہ شور رجز خوانی گیا
دست و بازو شل اٹھائے کون اب تیغ و تبر

خوفِ شب خوں لے گیا صف بندیِ نو کا خیال
جرأت پرواز لے ڈوبی شکست بال و پر

کچھ زبانوں پر ہے اب بھی شکوۂ باغ فدک
"کچھ" بزعم خود وفادار ابوبکرؓ و عمرؓ

جب ہوں سب مصروفِ تزئین در و دیوار و ذات
جب ہوں سب دلدادۂ اسباب شان و کر و فر
کون ہوگا کرب احساس زیاں میں اشکبار
کس کو ہوگا شکوۂ محرومی فکر و نظر

"زیستن در بند قوم و مردن اندر بند قوم"
اس نصیحت پر "وبال دوش" ہوگا کس کا سر
قومیت، مذہب، مفاد اقتصادی اور زباں
ان سبھی اصنام میں نکلا نہ کوئی معتبر

مدتوں سے ہے یہی انداز فکر روز و شب
اک خلش سی اعظمیؔ رہتی ہے اب شام و سحر
کیا ہوا کرتا ہے فردا صورت امروز بھی
لوٹ کر آتا ہے کیا ماضی کبھی بار دگر

سکریٹری رپورٹ

مذاکرۂ علمی

ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں

منعقدہ ۱؍۳؍ نومبر ۱۹۹۶ء دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم المرسلین سیدنا ومولانا محمد الأمین وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین ۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ مذاکرات علمی کا یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ یہ اہل صلاح اصحاب علم وادب کا ایک وسیع اور علمی اجتماع بن گیا ہے۔ ادب کا علم کے ساتھ امتزاج علم کے فائدہ کے ساتھ ادب کی لذّت کو شامل کر دیتا ہے اور ادب میں لطف کے ساتھ افادیت کا اضافہ کر دیتا ہے، روکھا سوکھا علم عموماً دل پر جبر کر کے اور فائدہ کے حصول کے لیے ایک انسانی فریضہ سمجھ کر طلب کیا جاتا ہے اور بے مقصد ادب لذّت ولطف کا حامل ہوتا ہے لیکن اس سے انسان کی کوئی قابل ذکر ضرورت پوری نہیں ہوتی ادب کو بے مقصد بنا دینے والوں نے دراصل اپنی خواہش نفس کو صالح انسانی قیود سے آزاد کرلینے کی یہ ایک تدبیر کی اور اس طرح انھوں نے ذوق وفن کے نام پر صدیوں کی بنی ہوئی اقدار سے اپنے کو آزاد کرلینے کی تدبیر کی۔

انسان نے انسانی اقدار سے آزادی حاصل کرنا چاہی تو اس کے ضمن میں ادب کے دائرے کے اندر بھی اپنی قدیم اقدار سے باہر ہونے لگا، اور اس نے زندگی کا ایسا چمن بنانا چاہا جس میں حسن کو قبیح اور قبیح کو حسن اور مفید کو مضر اور مضر کو مفید بنا دیا۔

عصر جدید کا انسان یورپ سے آئے ہوئے ادبی نظریات و فلسفوں کی حکمرانی میں آگیا ہے اس کے نتیجہ میں ادب نے بھی ان فلسفوں کے اثر سے نئے چولے اختیار کر لیے ہیں، جن کی وجہ سے صالح انسانی روایات و اخلاق و عادات کو بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہمارے انسانی اقدار کے ماننے والے اُدباء کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کریں اور ادب کی صالح اقدار کو بچانے کی کوشش کریں اور ادب کو اس کے صالح ڈگر پر چلانے کی جدوجہد کریں۔ اور ادب کو بے دینی اور لا اخلاقی کا ترجمان بنا دینے کا مقابلہ کریں، اور اس کو انسانی مصلحت اور اخلاقی اقدار کا حامل بننے کے راستہ پر واپس لائیں۔

رابطہ ادب اسلامی نے اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے جو جدوجہد شروع کی اس کا ایک نمونہ آپ اس کے مذاکرۂ علمی کے موضوع بحث کی صورت میں دیکھ رہے ہیں رابطہ ادب اسلامی کا یہ تیرہواں سالانہ مذاکرۂ علمی ہے جو آج اس اسلامی شناخت رکھنے والے شہر حیدرآباد میں منعقد ہو رہا ہے یہ شہر صرف اسلامی شناخت ہی نہیں رکھتا بلکہ ادب کی بہبود و ترقی میں بھی اس شہر کا بڑا حصہ رہا ہے اور ادب اردو کے لیے تو یہ اس کے چار معیاری مراکز میں سے ایک رہا ہے اور اردو زبان کے آغاز و ترقی میں بھی اس کو کلیدی مقام حاصل رہا ہے۔

یہاں رابطہ ادب اسلامی آج سے کئی سال قبل بھی مذاکرۂ علمی منعقد کر چکا ہے جو حصول آزادی میں ادب کا حصہ کے موضوع پر تھا، آج کا مذاکرۂ علمی ملفوظات و مواعظ کے ادبی پہلو پر منعقد ہو رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اس میں اس کے ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ تعاون و ہمدردی کا جذبہ کام کرتا ہے، باپ کو اپنے بیٹے سے بیٹے کو اپنے باپ سے بھائی کو بھائی سے دوست کو دوست سے رفیق سفر و رفیق کار کو اپنے رفیق سفر اور رفیق کار سے ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اس کا خیر خواہ ہوتا ہے اس کو اپنی مصلحت کے ساتھ اپنے اس تعلق والے کی مصلحت سے بھی دلچسپی ہوتی ہے یہ دلچسپی ذہنی بھی ہوتی ہے اور قلبی بھی ہوتی ہے۔ اور کسی کی مصلحت طلبی میں قلب و ذہن دونوں شریک ہو جائیں تو اس میں ایک خاص قسم کی تاثیر اور طاقت شامل ہو جاتی ہے۔ اس تاثیر و طاقت کو اگر الفاظ میں ادا

کر دیا جائے تو الفاظ کا یہ مجموعہ ایک شاندار ادب بن جاتا ہے اور اس کا بڑا حصّہ بہت سے مواعظ و ملفوظات میں ملتا ہے۔

ادب کی تاریخ میں کلام انسانی کے اس طرح کے نمونے جا بجا ملتے ہیں، جا بجا ملنے والے یہ نمونے وہ ہوتے ہیں جن کو کتابوں نے محفوظ کر لیا ہے اور قدیم نمونوں کی جھلک ہم کو قرآن مجید میں ملتی ہے جس میں قدیم قوموں اور ان کے انبیاء کا تذکرہ ہے انبیاء نے اپنی قوموں کو ان کے فائدے کی جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اس کے جستہ جستہ تذکرے ملتے ہیں، حضرت نوح علیہ السّلام قدیم ترین قوم کے نبی تھے ۹۵۰ سو سال تک اپنی قوم کو نصیحت کرتے اور سمجھاتے رہے اس بات کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت نوح نے دل کی کن گہرائیوں سے اپنی قوم کو نصیحت کی ان کے انداز کلام کا ذکر کیا ہے اس کو پڑھئے تو دل پر اثر پڑتا ہے ان کے بعد آنے والے نبیوں کی نصیحتوں کا تذکرہ بھی قرآن مجید میں ملتا ہے نبیوں کے علاوہ بعض دیگر عظیم شخصیتوں کی نصیحتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں حضرت لقمان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان نصیحتوں میں حکمت و موعظۂ حسنہ کا عنصر پوری طرح غالب ہے۔ حکمت یہ کہ موقع و محل کا خیال رکھ کر اور سننے والے کی ذہنی و قلبی کیفیت کی رعایت کرتے ہوئے بات کہی جائے اور موعظۂ حسنہ یہ کہ ایسے انداز سے مخاطب کیا جائے کہ بات دل لگتی معلوم ہو، بات دل لگتی اس وقت ہوتی ہے جب وہ صرف ذہن کو مخاطب نہ کرے بلکہ قلب تک پہونچے ادب کے سلسلہ میں سب سے بڑی گر کی بات یہی ہے کہ وہ قلب تک پہونچے، زبان کے الفاظ صرف سیدھا سادہ مطلب ہی ادا نہیں کرتے بلکہ وہ مطلب کے ساتھ ساتھ ان سے دل کے احساس و تأثر کی جو کیفیت وابستہ ہو جاتی ہے اس کو ادا کرنے کی بھی ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک ادیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے وابستہ ان کیفیتوں کو سمجھتا ہو اور پھر ان کے مطابق الفاظ اختیار کرتا ہو اور اگر بات خود ادیب ہی کی ہے تو پھر اس کا یہ عمل فطری عمل بن جاتا ہے۔ ہم کو ادیب دونوں طرح کے ملتے ہیں ایک وہ جن کی خود اپنی واردات ہوتی ہے ان کا ادب فطری ہوتا ہے دوسرے ادیب وہ ہوتے ہیں کی واردات خود ان کی نہیں ہوتی ہیں وہ محاکات سے کام لیتے

ہیں اور دوسروں کی واردات کو اپنی قابلیت سے بالکل فطری جیسا بنا لیتے ہیں۔

انسانی احساسات وجذبات کے لحاظ سے انسانوں میں بڑی مماثلت ویکسانی ہوتی ہے اس لیے کوئی آدمی اپنے عہد کے آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے اس طرح بات کرسکتا ہے کہ سننے والے کی واردات واحساسات کا پورا لحاظ کرے۔ ہم کو نصیحت وموعظت کے تین ایسے بڑے شاندار نمونے ملتے ہیں، جن میں مخاطب کے احساسات وواردات کی رعایت پائی جاتی ہے، اور اس کی بنا پر نصیحت کرنے والے کا کلام بڑا پر اثر ہوجاتا ہے۔

انبیاء پھر نیک دل ونیک صفات کے حامل مصلحوں مربیوں اور صوفیاء کے یہاں اس کے بے شمار نمونے ملتے ہیں، ہمارا یہ مذاکرۂ علمی اسی نوع کے ادب کو اپنا موضوع بحث بنا رہا ہے۔

رابطہ ادب اسلامی نے ایسے ادب کی طرف توجہ دہانی اور ادب کی صحیح وسعتوں کی نشاندہی بلکہ اس کی مثالوں کو پیش کرنے اور نئی مثالیں قائم کرنے کی فکر کے کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اس راہ میں اس کے سال بسال سفر کرنے کی یہ تیرہویں منزل ہے۔ اس سے قبل رابطہ نے ادب کے اسلامی تعین کی وضاحت کے لیے ۱۲ مذاکرات علمی ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں میں منعقد کیے، جن میں یونیورسٹیوں کے ادیب، عربی درس گاہوں کے ادب نواز اساتذہ، ادبی وعلمی اداروں کے اصحاب بحث وتحقیق کی ایک تعداد شرکت کرتی رہی، جنھوں نے مفید تحقیقی وادبی کاوشیں پیش کیں ہمارے سابقہ مذاکروں میں ایسے ادبی موضوعات کو عنوان مذاکرہ بنایا گیا جو نمایاں کیے جانے کے لحاظ سے نئے تھے، ان میں دعاء ومناجات کو ادبی پس منظر میں، نعتیہ شاعری کی ادبی خصوصیات، حدیث نبوی کا ادبی امتیاز، دعوت واصلاح کا ادبی پہلو، سفرناموں کی ادبیت، مکاتیب وخطوط ادبی لحاظ سے، اس طرح کے کئی عنوانات موضوع بحث بنے، اور مفید وفکر انگیز مقالے پیش کیے گئے۔

رابطہ ادب اسلامی نے کئی سال تک عربی میں پندرہ روزہ ادبی رسالہ نکالا اور اب اس کی جگہ پر ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "کاروان ادب اسلامی" شائع کر رہا ہے جس میں رابطہ کے منعقدہ مذاکرات علمی کے چیدہ چیدہ مضامین اور ادب کے دیگر انواع پر بھی مقالات اور نثر وشعر

کی ادبی کاوشیں پیش کی جاتی ہیں، رابطہ ادب اسلامی کے دفتر نے ادب اسلامی کے موضوع پر کئی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی کا قیام آج سے ۱۲ سال قبل ہوا تھا اس کا کام الحمدللہ اس وقت تک دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں پھیل چکا ہے اور اس کے مراکز انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک مختلف ممالک میں قائم ہو چکے ہیں، ان کے صدر دفتر دو جگہوں پر ہیں ایک عربی دنیا کے لیے عرب میں دوسرا مشرقی دنیا کے لیے لکھنؤ ہندوستان میں دونوں دفتر اپنے صدر معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کی سرپرستی میں قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں۔

ہمارا یہ اور اس سے قبل کے مذاکرات علمی مشرقی دنیا کے دفتر کی زیر سرکردگی میں منعقد ہوئے ہیں جس میں مقام انعقاد کے کسی مؤقر ادارہ کی طرف سے میزبانی حاصل ہوتی ہے ہم دارالعلوم سبیل السلام کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہمارے حالیہ مذاکرۂ علمی کی میزبانی سے ہم کو نوازا اس کے ادب شناس اور علم نواز ناظم مولانا محمد رضوان القاسمی نے تقاضہ کر کے اپنے ادارہ کو میزبان بنائے جانے کی پیش کش کی یہ ان کے ذوق علمی اور ادب اسلامی کے کام میں مدد دینے کے جذبہ کا نتیجہ ہے، ہم اس کو ادب اسلامی کے کام کے فروغ کے لیے ایک خوش آئند باب سمجھتے ہیں اور ان کے شکر گذار ہیں۔

حضرات ہمارے اس سیمنار میں ہندستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور علمی و ادبی کاموں کے ذمہ دار، عربی و ادبی مراکز کے اصحاب تحقیق اور نثر و نظم کے ممتاز اہل فن شریک ہو رہے ہیں ہم انشاءاللہ ان کے قیمتی اور مفید مقالات سے مستفید ہوں گے، متعدد عرب ادیب و شاعر بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ان کے ساتھ بھی مفید مقالات ہیں ملیشا سے بھی کئی فضلاء تشریف لائے ہیں یہ سب ہمارے اس سیمینار کو نہ صرف یہ کہ زینت بخش رہے ہیں بلکہ اس کی افادیت کو بہت بڑھا رہے ہیں، میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا یہ مذاکرۂ علمی اس سلسلہ کا ایک ممتاز مذاکرۂ علمی ثابت ہوگا۔

مولانا محمد رضوان القاسمی

خطبہ استقبالیہ

تیرھواں علمی مذاکرہ (سیمینار) رابطہ ادب اسلامی

بعنوان: ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ و صحبہ اجمعین۔

صدر محترم اور حضرات گرامی قدر!

آج کا دن نہ صرف دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد بلکہ شہر اور اس ریاست کے لیے مسرت وافتخار کا دن اور ہمیشہ یاد رکھی جانے والی یادگار تاریخ ہے۔ ہمیں آج اس بات کی سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ ہم علم وقلم اور زبان وادب کے ایک ایسے قافلہ کی میزبانی کریں، جو اپنے ساتھ اخلاق، انسانیت، شرافت، محبت ووفا اور صدق وراستی سے معمور قلم کا تحفہ لے کر آیا ہے اور دنیائے علم وادب کو اسی کی دعوت دیتا ہے، جو موجودہ دور کی ہوسناکیوں میں کھوئے ہوئے ادباء کو اس لافانی ادب کی طرف متوجہ کرنے کا پیغام دیتا ہے، جس کی جڑیں آسمانی صحیفوں اور وحی ورسالت میں پیوست ہیں۔

اس وقت میرے کانوں میں اس تحریک کے بانی اور مؤسس مفکر اسلام اور صاحب طرز ادیب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں، جو آپ نے اس موضوع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۸۱ء کو پہلے بین الاقوامی سیمینار کے دعوت نامہ میں تحریر فرمایا تھا۔

"اس مصنوعی ادب اور قلب وعقیدہ کی زبان سے نکلنے والی تحریروں کے درمیان وہی

فرق ہے جو انسان اور اس کی تصویر کے درمیان ہوتا ہے، یا کرایہ پر رونے والی اور اس چوٹ کھائی ہوئی ماں کے درمیان ہوتا ہے، جس کا اپنا بچہ موت کا شکار ہوگیا ہو، یہ پیشہ ور ادیب اپنی تحریروں میں ان بہروپیوں کے مشابہ نظر آتے ہیں جو کبھی بادشاہوں کا رول ادا کرتے ہیں، تو شاہانہ جاہ وجلال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، کبھی فقیروں کا کردار ادا کرتے ہیں تو فقیروں کا لباس پہن لیتے ہیں، کبھی قسمت کے دھنی کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور کبھی قسمت کے مارے کا، لیکن نہ تو سعادت وخوش بختی کا سایہ ان کو نصیب ہوتا ہے اور نہ فقر وفاقہ اور بدبختی کی آنچ ان تک پہنچتی ہے، کبھی کسی غم زدہ کے غم کی کسک محسوس کیے بغیر اس کے غم میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی کسی خوش نصیب کی مسرتوں کے احساس مسرت میں شرکت کیے بغیر اس کو مبارک باد پیش کرتے ہیں"

(دین وادب، مرتبہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی ص۱۶)

مولانا نے ادباء اسلام کو اس مکتوب کے ذریعہ جو پیغام درد دیا تھا، بحمداللہ وہ ضائع نہیں ہوا، اور پورے عالم اسلام کے ادبی حلقے میں ایک خاص تحریک پیدا کردی، اور ان کو اس موضوع کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا احساس پیدا ہوا، اور ہدایت ربانی کے سب سے بڑے مرکز "بلد امین" مکہ مکرمہ میں ۲ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو باضابطہ رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور جب سے اب تک عزم وحوصلہ اور تیز گامی کے ساتھ اس کارواں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

ادبیات اسلامی، اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات، اردو زبان وادب پر حضرت سید احمد شہید کی تحریکات کے اثرات، حمد ومناجات، نعتیہ شاعری، تحریک آزادی میں ادب اسلامی کا حصہ، دعوتی واصلاحی ادب، حدیث شریف کی ادبی خصوصیات، ادب میں سفرناموں کی اہمیت اور سوانحی ادب وتذکرہ نویسی جیسے اہم موضوعات پر صرف ہندوستان میں اس نے علم وتحقیق کی محفلیں آراستہ کی ہیں، اس کے علاوہ بنگلہ دیش اور ترکی میں بھی اس نے نہایت کامیاب اور مؤثر علمی، ادبی مذاکرات منعقد کیے ہیں۔ اور ہم اہل ہند کی خوش بختی ہے کہ جہاں رابطہ نے عربی زبان میں "مجلۃ الادب الاسلامی" کے نام سے اپنے رسالہ کی اشاعت

شروع کی، وہیں برصغیر کے اہل طلب کو بھی تشنہ کام نہیں چھوڑا، اور یہاں بھی "کاروانِ ادب" کی صورت میں نہایت وقیع علمی ادبی اور تحقیقی اردو مجلّہ کی اجرائی عمل میں آئی، جو رابطہ کے برصغیر کے عالی قدر ناظم اور اس رسالہ کے مدیر حضرت مولانا محمد رابع ندوی مدظلّہ کی صلاحیت، محنت وجانفشانی اور مسلسل توجہ سے عبارت ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

یہ سیمینار جو رابطہ کا تیرہواں سیمینار ہے، نہایت اہم اور فکر انگیز موضوع سے متعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج کی تبدیلی اور معاشرتی اور فکری انقلاب میں مواعظ وخطبات اور مجالس وملفوظات کا خصوصی کردار رہا ہے اور کوئی حقیقت پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا اس ملک میں صوفیاء اور درویشوں اور صلحاء امت کی مجلسی گفتگو اور ملفوظات نے ہمیشہ ایمان کی انگیٹھیاں سلگائی ہیں، اور انسانیت کو بڑے بڑے فتنوں سے بچایا ہے۔ اس لیے بجا طور پر ہمیں امید ہے کہ یہ علمی وادبی مذاکرہ نہایت مفید اور مؤثر مذاکرہ ثابت ہوگا، اور ایسے گوشوں سے ادب کے لعل وگہر حاصل کیے جائیں گے جہاں اس متاع گرانمایہ کی موجودگی کا شاید لوگوں کو خیال بھی نہ گزرتا ہو، ملفوظات کی حیثیت اور اہمیت پر ایک صاحب قلم نے لکھا ہے:۔

"ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، ان بیانات کا جو اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کی ترغیب وتحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں، ان میں سامعین کی استعداد کا، ان کے امراض قلبیہ کے دفعیہ کا، اور ان کی روحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے، اکابر اولیاء اللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو اثر وتاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے، ملفوظات کو اشارات وارشادات اور اقوال وفوائد بھی کہتے ہیں، اور ان کے مجموعوں کو کتب اہل سلوک اور کتب مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

ملفوظات کو زمانہ قدیم سے اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے، انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور انھیں اصلاح حال کے لیے نفع بخش مانا جاتا ہے، ان کا شمار کتب اہلِ سلوک اور کتب مشائخ میں ہوتا ہے، حضرت بابا صاحب کا ارشاد ہے:۔

"اگر کسے را شیخے کامل بنا شد کتاب اہل سلوک پیش خود دارد و متابعت آں نماید" (راحت القلوب ص ۱۵)

حضرت محبوب الٰہی نے بارہا خواجہ امیر حسن علائجزی کو نصیحت فرمائی ہے:

کتاب مشائخ و اشارات ایشاں کہ در سلوک راندہ اند در نظر می باید داشت۔

(مشائخ کی کتاب اور ان کے اشارات جو انھوں نے سلوک کے باب میں فرمائے ہیں مطالعہ میں رکھنے چاہئیں۔)

ان اشارات سے مشائخ کرام کی کتابوں کا وجود، ان کا منفعت بخش ہونا اور ان کی قدر و منزلت واضح ہے۔ اصل جمال کی تفصیل کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"جب میں حضرت باباصاحب (شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز) کی خدمت فیض درجت سے وابستہ ہوا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جو کچھ میں آپ کی زبان مبارک سے سنوں گا وہ لکھ لیا کروں گا۔ لہٰذا جو کچھ میں حضرت باباصاحب سے سنتا وہ لکھ لیا کرتا، جب اپنی قیام گاہ پر واپس آتا تو کتاب میں لکھ لیتا، اس کے بعد بھی جو کچھ سنتا اسے لکھ لیتا، حتیٰ کہ یہ بات میں نے حضرت باباصاحب کو بتادی، اس کے بعد حضرت باباصاحب کوئی حکایت یا کوئی اشارہ فرماتے تو مجھ سے فرماتے حاضر ہو یہاں تک کہ اگر میں موجود نہ ہوتا اور دیر سے حاضر خدمت ہوتا تو جو کچھ بیان فرما چکے ہوتے اسے دوبارہ بیان فرماتے۔"

(آئینہ ملفوظات از علامہ اخلاق حسین دہلوی صفحہ ۲۹ تا ۳۰)

جہاں تک تعلق مواعظ و خطبات کا ہے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ و خطبات کے سلسلہ میں اپنے درج ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، تاہم اثر آفرینی اور اصلاح خلق کے باب میں دوسرے بزرگان دین کے مواعظ و خطبات کے بارے میں بھی کم و بیش ان تاثرات کا اظہار کیا جا سکتا ہے حضرت مولانا فرماتے ہیں:

"حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔ فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نائبین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات وضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لیے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم، اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات وشبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لیے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت وعظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور "صدیقین" کے کلام کی یہی شان ہے۔"

(تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول صفحہ ۲۰۸)

مہمانان کرام! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج آپ کا یہ تاریخی اجتماع ایک تاریخی شہر میں منعقد ہو رہا ہے، محمد قلی قطب شاہ جو اپنے زمانہ کا عابد وزاہد اور علم پرور حکمراں تھا نے ۹۹۹ھ ۱۵۹۰ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی، اور دکنی زبان میں خدا سے دعا کی۔

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر

بادشاہ کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی اور اس کی زندگی ہی میں شہر ایسا شاد وآباد ہوا کہ اس نے اپنے حسن انتخاب پر خود داد دی اور کہا:

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے، فرخندہ جائے

پھر اس شہر نے ہمیشہ شاعروں، ادیبوں، عالموں اور صوفیوں سے خراج تحسین وصول کیا، امیر مینائی بے ساختہ کہہ اٹھے۔

اللہ اللہ رے بہار چمنستانِ دکن
حور پر ہے یہ جوبن نہ پری پر یہ پھبن

شاہ نصیر نے جب دہلی سے حیدر آباد کے لیے رخت سفر باندھا تو اپنے شاگرد عزیز ذوق سے کہا کہ "وہ بہشت ہے بہشت میں جاتا ہوں، چلو تم بھی چلو"

مولانا حالی اور داغ نے اس شہر پر اپنے جذبات عقیدت نثار کئے اور میر احسن نے اس شہر کے لیے خدا سے دعا کی:

سرسبز یہ شہر حیدر آباد رہے
یارب، آباد حیدر آباد رہے

داغ دہلوی کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے۔

نہیں حیدر آباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

منشی بشویشور پرشاد منور لکھنوی کی ایک پوری نظم "دکن" پر ہے، جس کا ایک شعر ہے،

حسیں صبح دکن ہے، حسین شام دکن
جمیل فرش دکن ہے، جمیل بام دکن

یہ شہر صوفیوں کا شہر ہے، جہاں حضرت شاہ معین الدین چشتی معروف بہ حضرت شاہ خاموش نے اقامت اختیار کی، جس کو شیخ مخدوم علاء الدین انصاری اور حضرات یوسفین کے قیام کا شرف حاصل ہوا، اور کتنے ہی صوفیاء و مشائخ ہیں جو آج بھی اس کی آغوش میں محوِ خواب ہیں۔

یہ علماء اور محققین کا شہر ہے، علم خیز اور علم پرور بھی، تاریخ کے ہر دور میں بالخصوص ماضی قریب میں اصحاب تحقیق علماء کے قیام و ورود کا جو شرف اس شہر کو حاصل ہے، اس

کی مثال کم ملے گی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا الیاس برنی مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ماہر القادری، اور کیسے کیسے علماء ہیں جن کے فیضان علمی نے اس شہر کی علمی رونق میں اضافہ کیا، اور خود اس خطہ سے مولانا انوار اللہ خاں فاروقی محدث دکن، مولانا عبداللہ شاہ صاحب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جیسے اصحاب علم وفضل پیدا ہوئے، پیرس میں اسلامی دعوت کی جو عظیم شخصیت ایک عرصہ سے موجود ہے، اور جس نے اسلامی دنیا میں تحقیق وتصنیف کی ایک مثال قائم کی ہے، اور اس نے اس راہ میں نئے نئے چراغ جلائے ہیں، میری مراد ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ہے، ان کا تعلق بھی اسی "بغداد علمی" سے ہے، مشہور زمانہ سحر انگیز خطیب اور ریاض رسول کا چہکتا ہوا بلبل نواب بہادر یار جنگ بھی اسی خطہ ارضی سے پوری امت کے لیے اتحاد ومحبت کا پیغام اپنے خاص سُر اور لَے کے ساتھ دیتے رہے ہیں۔

یہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر ہے جہاں اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر "محمد قلی قطب شاہ" پیدا ہوئے۔ اور جو اُردو زبان کی معلوم تاریخ کے پہلے معروف شاعر "ولی دکنی" کا مسکن ہے، جہاں قطب شاہی دور میں اردو پیدا ہوئی، جس نے امجد حیدرآبادی جیسے مصلح اور مذہبی صفی جیسے قادر الکلام، مخدوم محی الدین جیسے باغی، انقلابی شاذ تمکنت جیسے جدید لب ولہجہ کے ترجمان اور اوج یعقوبی جیسے متین اور قدیم روایات کے امین شعراء کو وجود بخشا۔

عہد ادب اور اردو زبان میں اس شہر کی خدمت کو کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا، یہیں "دارالترجمہ" قائم ہوا، اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء تک اس نے سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے معیاری لٹریچر کو اُردو میں منتقل کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی دارالترجمہ نے اردو زبان میں وضع اصطلاحات کا کام کیا اور اس کے لیے پورے ملک سے منتخب علماء ادباء مولوی ظفر علی خاں، مولوی عبدالحلیم شرر اور مولانا عبداللہ عمادی وغیرہ سے مدد لی گئی۔

یہیں "دائرۃ المعارف العثمانیہ" کی بنیاد پڑی، جس نے علوم اسلامی کے سیکڑوں

مخطوطات کو زندگی عطا کی، اور انکو طبع کرایا۔ کنز العمال، بیہقی، مشکل الآثار، انساب، امام محمد کی کتاب الاصل، مولانا عبدالحی (پدر بزرگوار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کی کتاب "نزہتہ الخواطر" اور فقہ و حدیث، تفسیر و کلام، طب و ادب، سیرت و رجال اور لغت نیز فلسفہ و تاریخ کی کتنی ہی کتابیں ہیں جو اپنی طباعت و اشاعت اور تصحیح و تعلیق میں دائرۃ المعارف کی رہین منت ہیں مگر افسوس کہ دارالترجمہ کے بعد اب "دائرہ" حکومت کی بے واہی کا شکار رہے اور ملک کا ایک عظیم اور قیمتی ورثہ اس وقت کسی کی "نگاہ التفات" کا منتظر ہے، کیا عجب کوئی ساقی اپنے ہاتھ میں "مستانہ" تھامے ہوئے آئے جو اس علمی میخانہ کے بگڑے ہوئے دستور کو بدل دینے کا باعث بنے۔

اسی طرح اس شہر نے اپنے قیمتی، معیاری اور وسیع کتب خانوں کے ذریعہ بھی علم و ادب کی خدمت کی ہے، مفتی محمد سعید خاں کا کتب خانہ سعیدیہ اپنے علمی جواہر پاروں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) ملک کے چند معروف کتب خانوں میں ایک ہے، اردو کتابوں کے بھی متعدد اہم کتب خانے شہر میں موجود ہیں، علوم اسلامی کے مخطوطات کی حفاظت میں بھی غالباً پٹنہ اور کلکتہ کے بعد یہ شہر سب سے آگے ہے، اور مخطوطات و نوادرات کو اپنے دامن میں چھپائے رکھنے کی شہرت پوری دنیا میں اسے حاصل ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اس شہر کی رونق شاہی نوازشات اور حکومت کے زیر سایہ علمی و ادبی خدمات سے تھی، ۱۹۴۸ء کے بعد گو رونق و شادمانی کا یہ سامان باقی نہ رہا، لیکن عزت ایمانی اور اسلام کے لیے دردمندی نیز ادب پروری اور علم دوستی کا جو سبق یہاں کے اسلاف نے اپنے اخلاف کو دیا تھا۔ اس کی چنگاریاں اب بھی موجود تھیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ یہاں از سر نو ادبی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے، تنظیمیں اور جمعیتیں قائم ہوئیں اور جو پہلے سے قائم تھیں ان میں سرگرمی اور حرارت پیدا ہوئی، اور دینی مدارس و مکاتب قائم کیے گئے۔ جن کی ضرورت بہ مقابلہ دوسرے علاقوں کے یہاں زیادہ تھی، اسی طرح اب یہاں باوقار عصری درس گاہوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، متعدد انجینئرنگ کالجز ہیں، میڈیکل کالج بھی ہے،

متعدد ہاسپٹل بھی ہیں، اور یہ سب اقلیتی ادارے مسلم انتظامیہ کے تحت خوبی اور کامیابی کے ساتھ بحمد للہ چل رہے ہیں۔

"دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد" جس کو اس وقت آپ نے اپنی تشریف آوری کا شرف بخشا ہے۔ اسی تعلیمی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا ۱۳۹۳ھ میں قیام عمل میں آیا اور قیام کے سولہویں سال ۱۴۰۸ھ میں دورۂ حدیث شریف کا افتتاح ہوا، فقہ کے میدان میں مردان کار کی تیاری شروع سے جامعہ ہذا کے ذمہ داران اور اساتذہ کا مطمح نظر ہے، اسی مقصد کے لیے ۱۴۰۹ھ میں "تخصص فی الفقہ" کے دو سالہ نصاب کا افتتاح عمل میں آیا، فرق باطلہ اور قدیم وجدید مذاہب ونظام کے مطالعہ اور مخالف اسلام تحریکات سے آگہی نیز اسلام کے اصول دعوت سے واقفیت کے لیے ۱۴۱۰ھ میں "تخصص فی الدعوہ" کا شعبہ قائم ہوا، ۱۴۱۲ھ میں ائمہ مساجد کی تربیت وتدریب کے لیے "تدریب الائمہ" کا ایک سالہ نصاب شروع کیا گیا ہے۔ عربی اور اردو میں علی الترتیب پانچ سال اور تین سال کا مختصر مدتی عالم کورس بھی عصری تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے موجود ہے۔

فکری اعتدال، وسیع المشربی، فراخ چشمی، تنگ نظری سے گریز اور ہر مکتبہ فکر سے خیر کا حصول بحمد للہ اس ادارہ کے مزاج ومذاق میں داخل ہے۔ اور اسی لیے یہ دارالعلوم مختلف مکاتب فکر اور مختلف درس گاہوں کے اساتذہ وطلباء کا ایک گلدستہ سا ہے، اور بحمد للہ یہاں متعدد ایسے اساتذہ موجود ہیں جو اپنی علمی خدمات وتالیفات اور متوازن نیز مطالعہ وتحقیق پر مبنی آراء کی وجہ سے ملک بلکہ بیرون ملک بھی پہچانے اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اس نوعمر درس گاہ کے فضلاء اور متخصصین نے مختلف علمی اور تحقیقی موضوعات پر بہتر کام کیا ہے، جسے اہل علم اور اصحاب ذوق نے سراہا ہے، یہاں باضابطہ دارالاشاعت قائم ہے، اس کے علاوہ دارالقلم، مرکز البحث والدعوۃ (مرکز دعوت وتحقیق) اور طوبیٰ پبلیکیشنز کا اخلاقی رابطہ بھی اس ادارہ سے ہے، یہاں سے سہ ماہی جریدہ "صفا" بھی نکل رہا ہے، اس ادارہ میں کمپیوٹر کی تربیت کا بھی نظم ہے، بعض صنعتی شعبے بھی قائم ہیں، نصاب تعلیم کی

ترتیب میں "قدیم صالح اور جدید نافع" کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ باوقار کتب خانہ کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کے لیے دارالاخبار اور دارالمطالعہ بھی ہے۔ دیہاتوں میں دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے متعدد مکاتب چلائے جارہے ہیں، عمومی دعوت و تبلیغ اور صیانت عقیدہ ختم نبوت کے لیے مبلغین بھی ہیں، طلبہ اور اساتذہ دعوتی کام سے وابستہ بھی ہیں، اور تعطیلات میں عملاً اس کام میں حصہ لیتے ہیں۔ تاہم:

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

اس مبارک و مسعود موقع پر میں اپنے تمام رفقاء کی جانب سے رابطہ ادب اسلامی کے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور جنرل سکریٹری حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس سمینار کے لیے ہمیں میزبانی کا شرف بخشا، میں اپنے رفیق عزیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرا ہر حیثیت سے ساتھ دیا ہے۔ اور علمی و قلمی کاموں میں پوری دل چسپی لی ہے۔ مجلس استقبالیہ کے ذمہ داران جناب زاہد علی خاں، جناب محمد ہوشدار خاں، جناب محمد بھائی پٹنی، جناب عبداللہ بھائی پٹنی، جناب محمد جعفر، جناب سید جمیل الدین ایڈوکیٹ، جناب عبدالوہاب خاں، جناب عبدالقادر صاحب، جناب سید اعزاز الرحمٰن زاہد، جناب حفیظ الدین شیخ امام، جناب محمد اعظم، جناب اقبال علی، جناب مقصود علی (اے ٹو زیڈ سپلائنگ کمپنی) اور تمام ارکان استقبالیہ نیز دارالعلوم سبیل السلام کے تمام اساتذہ عملہ، کارکنان، طلبہ اور شعبہ تعمیرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان تمام حضرات نے بڑی تندہی اور جذبہ اخلاص کے ساتھ سعی و کوشش کی ہے۔ اسی طرح روزنامہ سیاست، رہنمائے دکن، منصف، عوام اور دیگر رسائل و اخبارات، بلدیہ حیدرآباد اور جملہ معاونین کا شکر گذار ہوں کہ ان سب کے تعاون سے سمینار کے انعقاد میں بڑی مدد ملی ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو بہترین اجر عطا فرمائے (آمین)

مجھے احساس ہے اور یہ محض رسمی نہیں بلکہ واقعی ہے کہ آپ مہمانان کرام کے لیے جیسا کچھ سامان راحت کیا جانا چاہیے، نہ کیا جا سکا، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اسی احساس کے ساتھ اس کو گوارا کریں گے کہ آپ اپنے ہی گھر اور اپنی ہی بستی میں آئے ہوئے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ یہاں کے انتظام و انصرام کی خامیوں اور آپ کے ضیافت اور حق اکرام میں کوتاہیوں کو آپ اسی نگاہ سے دیکھیں گے۔

علم و قلم کا یہ قافلہ جو "ملفوظات و مواعظ" کی خوشبوؤں کو پھیلانے یہاں آیا ہے اس میں بلاشبہ مرکزی کردار "دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ" کا ہے، اس مناسبت سے مجھے اس وقت ہندوستان کے مشہور عالم و محدث اور شاعر و ادیب علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (۱۳۲۲-۱۲۷۸ھ) یاد آرہے ہیں، علامہ نیموی کے وقت میں ندوہ کا ایک وفد جب لکھنؤ سے پٹنہ آیا تھا تو اس وفد کی آمد سے علامہ نیموی بہت خوش ہوئے تھے، اور اپنی اس خوشی کا اظہار انھوں نے اپنے چند قطعات کے ذریعہ کیا تھا، ان قطعات کی حیثیت یقیناً تاریخی و ادبی ہے، اور تاریخ و ادب کے دامن سے وابستہ ہونے والے اس سیمینار کے "استقبالی کلمات" کو میں انھیں قطعات پر ختم کرنا چاہتا ہوں، البتہ "پٹنہ" کی جگہ "اس شہر" کر دیا گیا ہے، اور اس میں جو جذبات پیش کیے گئے ہیں، ندوہ کے ساتھ دین و ادب کے تمام قافلہ پر بہار کے لیے علامہ نیموی کے حسن توسط سے پیش کرتا ہوں، علامہ نیموی فرماتے ہیں:

اس شہر میں جو شوق اہل ندوہ آئے — کیا کیا برکات ساتھ اپنے لائے
دیکھو چھایا ہوا ہے ابر رحمت — لاکھوں گھر مراد ہم نے پائے

آیا ہے جو وفد ندوہ ذی شوکت — چھائی ہوئی ہے کیسی خدا کی رحمت
گھر بیٹھے مراد ہم نے پائی اے شوق — اللہ اللہ یہ ہماری قسمت

ندوہ کی طرف سے آئے ہیں جو علماء نائب ہیں رسول حق کے ہیں راہ نما
اسلام یہ پھیلائیں گے اک عالم میں چمکیں گے جس کے نور سے ارض و سما

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و ادب کی اس انجمن کو شاد کام و بامرام رکھے، اس کا سفر ارتقاء جاری رہے، اور مرحلہ شوق کبھی طے نہ ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ابتدائیہ

سہ ماہی کاروان ادب نے اپنے ادبی اور علمی سفر کا خاصا اہم حصّہ طے کر لیا، اس کی اہمیت اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ فی زمانہ ایک ایسی زبان کا سہ ماہی رسالہ جس سے قارئین کا تعلق وفاداری سے زیادہ وضعداری اور ضرورتاً سے زیادہ اخلاقاً ہی رہتا ہے، وہ بھی ایسے موضوع پر جس سے دل چسپی روا روی میں نہیں لی جا سکتی، اس کے لیے پورے وقار و سنجیدگی کی رسد اور فکر و عمل کی کمک چاہیئے۔ ادب اسلامی کی تحریک اور اس کا ترجمان یہ کاروان ادب اپنے چاہنے والوں سے ایمان و احتساب، خوش ذوقی، جذبۂ وفاء مقصدیت، دست زیریں (ید سفلی) کے بجائے دستِ بالا (ید علیا) کا طلب گار ہے۔

اس رسالے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ کسی ایک موضوع پر بہت سے وقیع مضامین اس میں یکجا مل جاتے ہیں، جس سے درس و تحقیق و تصنیف کے کار پردازوں کو بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح اس کا ہر شمارہ آئندہ علمی کام کرنے والوں کے لیے ایک معتبر علمی و ادبی سرچشمہ ثابت ہوگا۔

ہندوستان اور مشرقی ایشیائی خطہ کے مرکز ادب اسلامی کی طرف سے ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے پابندی کے ساتھ ہر سال علمی سمینار منعقد کیے جاتے ہیں دوسرے مروجہ سمیناروں اور کانفرنسوں کے برخلاف سفر و زاد سفر کی سہولتوں کے نہ دیئے جانے کے باوجود ادب اسلامی کے سمیناروں کو کبھی حاضرین اور مقالہ نگاروں کی کمی کا احساس نہیں ہو پایا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی جائے تنگ است و مہماں بسیار کا سماں دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر سمینار مقالہ نگاروں کی اہمیت مقالوں کی افادیت و معقولیت کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوتا ہے۔ سمینار میں جو مقالات پڑھے گئے تھے، ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو کاروان ادب کے اس حصّہ میں دیئے جا رہے ہیں۔ پرچے کی مقررہ ضخامت کی وجہ سے یہ انتخاب کرنا پڑا، جو مقالے شائع نہیں کیے جا سکے وہ کسی اور موقع پر یا کسی پرچہ میں شائع کیے جا سکتے ہیں۔ تنگ دامانی کی وجہ سے ان کو نہ لینے کی مجبوری پیش آئی۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

اور ان کے ملفوظات و مواعظ

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۳۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ ابوالعباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد راشد المقتفی لامر اللہ والمستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخؒ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول[1] خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود

---

[1] ابن کثیر نے اس کے مناقب میں لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، حوصلہ مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گذار

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستہ میں قتل کر دیا۔"

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوز دروں نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

خلیفہ تھا، اور خاص و عام سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۴۵ سال ۳ ماہ کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ سال اور ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۵)

کے ساتھ وعظ وارشاد، دعوت وتربیت، اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حب دنیا کی تحقیر وتذلیل، ایمانی شعور کے احیا، عقیدۂ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

شیخ کے مواعظ کی اثر انگیزی

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نائبین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات وضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات وشبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت وعظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور "صدیقین" کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع وضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا

تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب و داب دل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری، بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے، تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹالے اور اس سے خوف و امید ترک کر دے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے"[1]

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:۔

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سڑاہند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار، و رفیقان گمراہ، و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک

---

[1] رموز الغیب ترجمہ فتوح الغیب مقالہ (۱۷) صـ۴۹

جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے۔"[۵]

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکا سے نفرت، اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے، میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی، اور رخنہ پڑ جاتا ہے، یا تو جدائی ہو جاتی ہے، یا وہ مر جاتا ہے یا رنجش ہو جاتی ہے، اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب، اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا، اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ" وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے" اور یہ ارشاد کہ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ" خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے" عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا" اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی، اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے، اور ہر چیز پر غالب و زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کرے، خاص اپنے لئے بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ" وہ ان لوگوں کو

---

[۵] فیوضِ یزدانی مجلس ۲۰۔ ص ۱۳۷

رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑکر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش واحسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے"۔[۱]

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف بیان فرماتے ہیں:۔

"ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالے اس کو ان کے ہاتھوں کرادیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں، جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالے ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہوگیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں"۔[۲]

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

• آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

---

۱ رموز الغیب مقالہ (۶۲) ص۱۵۷ ۲ فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مجلس ۱۳ ص۸۹

دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اپنے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل و عیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست، کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب سے پاک و صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے، تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں، اور اس کے گرداگرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضر نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں، اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انھیں نفع پہونچانے کے لئے۔"[1]

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۳۲) ص ۸۶-۸۴

طبقہ کی دلجوئی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں، ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے خالی ہاتھ فقیر! اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گمنام اے بھوکے پیاسے ننگے، جگر جلے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھٹکارے ہوئے، اے وہ کہ ہر مراد سے محروم، خاک پر پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں کے) پشتے لگے ہیں، مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا، اور جمعیتِ (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا، اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گمنام کیا، اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں، اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے، اور میں بھی، اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت مٹیار زمین (کے مثل) بے ریت ہے، اور رحمتِ حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرداگرد ہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیخ اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کلّے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کام کے بدلہ میں جو وہ کرتے رہے ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیا دی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ رتیلی، اور پتھریلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے، جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو، اور وہ کھاد دنیا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درختِ ایمان اور نہالِ اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں، حفاظت ہو، اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالےٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دولتمند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے، اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی، اور اس کا مکاؤ انہی چیزوں سے ہے، جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں، اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں، تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالےٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین، علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہو جانے کی نہ پروا رہے گی۔"[1]

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر ضرورت

---

[1] رموز الغیب مقالہ (۲۵) ص ۶۴-۶۵

انتفاع سے منع نہیں فرماتے اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں ان کے مواعظ در حقیقت حدیث نبوی "انّ الدّنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للاخرۃ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں ایک موقع پر فرماتے ہیں

"دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالےٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو ذلیل کرتی ہے کھا حق تعالےٰ کے ساتھ عزت و تونگری کے قدم پر"[۱]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے :-

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے"[۲]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ
اور
ان کے ملفوظات

محبوب الٰہی کے ملفوظات

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات جن کی حیثیت گویا ان کی تصانیف کی ہے، حسب ذیل ہیں:۔

(۱) فوائد الفواد (۲) افضل الفواد (۳) راحت المحبین (۴) سیر الاولیاء،

اوّل الذکر کو خواجہ حسن سنجری نے مرتب کیا ہے، جو محبوبؒ الٰہی کے محبوب خلفاء میں تھے، سیر العارفین کے مؤلف کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت شیخ نظام الدینؒ حضرت شیخ بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مزار پر تشریف لے گئے، وہاں سے حوض شمسی کے پاس بعض بزرگان دین کی فاتحہ خوانی کے لیے پہنچے تو دیکھا کہ خواجہ حسن سنجری اپنے دوستوں سے رندانہ مشاغل میں مشغول ہیں۔ خواجہ حسن بچپن میں حضرت محبوبؒ الٰہی کے ساتھ بدایوں میں رہ چکے تھے، ان کو بچپن کی صحبت یاد آگئی، اور محبوبؒ الٰہی کو دیکھ کر مستانہ وار یہ دو بیت زبان پر لائے۔

لہ خواجہ شمس الدین دھاری نے بھی حضرت محبوبؒ الٰہی کے ملفوظات جمع کیے تھے، مگر اس کا نام نہ معلوم ہو سکا۔

سالہا باشد کہ ما ہم صحبتیم گر ز صحبتہا اثر باشد کجاست
زہد تاں ایں فسق ما را کم نکرد فسقِ ما محکم تر از زہدِ شماست

محبوبؒ الٰہی نے یہ سن کر فرمایا کہ اثر صحبت بھی اپنا محل و موقع چاہتا ہے، تاثیر صحبت کی صورتیں مختلف ہیں، خواجہ حسن پر ان الفاظ نے سحر کا کام کیا، اسی وقت انکا دل جاری ہوگیا۔ قدموں پر گر پڑے۔ اور تمام افعال قبیحہ سے تائب ہوکر محبوبؒ الٰہی کے مرید ہوگئے، اس وقت ان کی عمر تہتر سال کی تھی، مرشد کی صحبت میں برابر رہنے لگے، اور ۷۰۷ھ سے ۷۱۹ھ تک جو کچھ مرشد کی زبان مبارک سے سنتے ان کو قلمبند کر لیتے، چنانچہ ان کے مرتب کردہ ملفوظات فوائد الفواد کو ہر زمانہ میں جو مقبولیت حاصل رہی وہ چشتیہ سلسلہ کے اور مشایخ کے ملفوظات کو شاید حاصل نہیں ہوئی، امیر خسرو کہا کرتے تھے کہ

"اے کاش میری تمام تصنیفات خواجہ حسن سے نامزد ہو جاتیں، اور ان کے بدلے میں کتاب فوائد الفواد کا حسن قبول میرے لئے نامزد ہو جاتا،[1]

حضرت محبوبؒ الٰہی کے خلیفہ مولانا علاء الدین نیلی ہمیشہ اسی کو پڑھا کرتے تھے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کوئی اور کتاب کیوں نہیں پڑھتے تو فرمایا میری نجات اسی سے ہے،

مرا نسیم تو باید صبا کجاست کہ نیست کجاست زلفِ تو مشک خطا کجاست کہ نیست

(سیر الاولیاء ص ۲۷۸)

ضیاء الدین برنی نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے، کہ

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۷۰۶، فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں: "امیر خسرو براں رشک .... بردہ گفت کاش تشریف قبول و تحسین آں نسخہ و تصنیف آں بمن منسوب گشتی و تمام تصانیف من بنام خواجہ حسن گردیدی۔

"در یں ایام فوائد الفواد دستور صادقان ارادت شدہ است[۱]"

عہد ہمایوں کے مصنف صاحب سیر العارفین کا بیان ہے، (ص ۷۸)

"فوائد الفواد اہل انابت کے لئے مونس جان اور دلی دل راہ ہے،"

فرشتہ رقم طراز ہے۔

"کتاب الفواد، بشرف قبول وتحسین سرفراز گشت[۲]"

مرآۃ الاسرار کے مؤلف مولانا عبد الرحمٰن چشتی لکھتے ہیں۔

"امروز آں فوائد الفواد مقبول اہل دلانِ عالم شدہ است و دستور عاشقاں گشتہ و شرق و غرب عالم گرفتہ"

بعد کے تذکرہ نگاروں میں خزینۃ الاصفیاء کے مؤلف نے لکھا ہے کہ

"کتاب فوائد الفواد از ملفوظاتِ حضرت شیخ تالیف کردہ دی خواجہ حسن است و بنہایت مقبول افتادہ[۳]"

امیر خسرو نے بھی اپنے مرشد کے ملفوظات افضل الفواد کے نام سے مرتب کئے ہیں[۴]، مگر اس کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات میں حضرت محبوبِ الٰہی کے ملفوظات میں ایک کتاب راحت المحبین بھی ہے، جس میں ان کے ایک نامعلوم مرید نے ۶۸۹ھ سے ۶۹۰ھ تک کے ملفوظات درج کئے ہیں[۵]،

خواجہ سید محمد مبارک امیر خورد بھی حضرت محبوبِ الٰہی کے مرید تھے، انھوں نے بھی سیر الاولیاء میں ان کے ملفوظات جمع کئے ہیں، اس کتاب میں خواجگانِ چشت کے حالات بھی ہیں، اور آخر میں محبوبِ الٰہی کے ملفوظات بھی ہیں،

ان تمام ملفوظات میں ایک سالک کو توبہ، استقامتِ توبہ، ایمان، استغراق،

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶، [۲] فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۳، [۳] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۲۶

نماز، تلاوتِ قرآن، اوراد و وظائف، فقر و فاقہ، ترک دنیا، جہد و طاعت، مشغولی حق مجاہدہ، صبر و رضا، توکل، احترامِ پیر، حلم و بردباری، اور جود و سخا وغیرہ کی وہی تعلیمات دی گئی ہیں، جو چشتیہ سلسلہ کے پیشرو مشائخ نے دی تھیں، ـــــ بطورِ نمونہ مزید تعلیمات ملاحظہ ہوں:۔

رہروانِ سلوک کی قسمیں | حضرت محبوبؒ الٰہی نے راہ سلوک کے رہروؤں کی تین قسمیں بتائی ہیں، (۱) سالک (۲) واقف (۳) راجع، اس راہ کے مسلسل چلنے والے سالک ہیں، اور جن کو طاعت و عبادت میں وقفہ حاصل ہو، وہ واقف ہیں، اور جو وقفہ میں پھر راہِ سلوک کی طرف رجوع نہ کریں؛ وہ راجع ہیں، (فوائد الفواد ص ۱۶)

راہِ سلوک کی لغزشیں | اس راہ میں مندرجۂ ذیل لغزشیں ہیں، (۱) اعراض (۲) حجاب (۳) تفاصل (۴) سلب مزید، (۵) سلب قدیم، (۶) تسلّی، (۷) عداوت،

ان کی تفصیل یہ بتائی ہے، کہ عاشق سے جب کوئی فعل یا حرکت ایسی سرزد ہو جائے جو معشوق کے لئے پسندیدہ خاطر نہ ہو تو وہ یعنی معشوق منھ پھیر لیتا ہے، اس کو اعراض کہتے ہیں، عاشق کو چاہیے کہ وہ استغفار اور معذرت کرے، اور جب اس کی معذرت قبول نہیں ہوتی تو دونوں کے درمیان حجاب پیدا ہو جاتا ہے، اس حجاب کے دور کرنے کے لئے عاشق خضوع و خشوع کیساتھ توبہ کرے، اور اگر توبہ قبول نہیں ہوتی ہے، تو تفاصل یعنی جدائی ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد بھی اگر استغفار قبول نہیں ہوتا، تو عاشق سے طاعت و عبادت کا ذوق سلب کر لیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ وہ اپنی قدیم عبادت کا ثواب بھی کھو بیٹھتا ہے، اور معشوق عاشق کے دل میں جدائی کی تمام صورتیں پیدا کر دیتا ہے، جس کو تسلّی کہتے ہیں، اس سے عاشق اہمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اور اس کی

محبت عداوت میں منتقل ہو جاتی ہے، (فوائد الفواد ص ۱۶-۱۷)

عزیمت | سالک کو ہر خطرہ کے حال میں خداوند تعالیٰ کی پناہ کا جویاں ہونا چاہئے، اس کا نام عزیمت ہے، اور پھر اس عزیمت کو عمل میں منتقل کر دینا چاہئے (فوائد الفواد ص ۱۸) جب سالک عبادت اور ریاضت کا آغاز کرتا ہے تو اس کو نفس پر گرانی محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ صدق دل سے اس کو جاری رکھتا ہے، تو اللہ تارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کو توفیق عطا ہوتی ہے، اور اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے (فوائد الفواد ص ۲۰-۲۱) اس کے بعد وہ مجاہدہ و ریاضت میں ذوق و شوق محسوس کرتا ہے، رفتہ رفتہ اس کو ایسا استغراق ہو جاتا ہے کہ یاد حق کے سوا ہر چیز اس راہ میں مانع ہو جاتی ہے (فوائد الفواد ص ۹۱)

فراغت قلب | اس راہ میں عاشق وہی ہے جو حضور اور غیبت کی حالت میں یکساں معشوق کی محبت کا دم بھرتا ہو، اور اس کے وصال کا ہمیشہ طالب رہتا ہو، محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبتِ ذات، دوسری محبت صفات، اول الذکر موہبت الٰہی ہے، اور آخر الذکر کسب سے حاصل ہوتی ہے، موہبتِ الٰہی کا تعلق بندہ کے عمل سے نہیں، مگر محبتِ صفات کو کسب سے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے قلب کو فارغ کر کے اس کو ذکر دوام میں مصروف رکھنا چاہئے، فراغِ قلب کو روکنے والی چار چیزیں ہیں، (۱) خلق (۲) دنیا (۳) نفس اور (۴) شیطان مگر دفع خلق کے لئے عزلت، دفع دنیا کے لئے قناعت اور دفع نفس و شیطان کے لئے اللہ جل شانہٗ سے التجا، فریاد گریہ و زاری ہو تو فراغتِ قلب حاصل ہو جاتی ہے،

عشق و محبت | درویش اہلِ عشق ہوتے ہیں، اور علماء اہلِ عقل، جب تک اللہ جل شانہٗ کی محبت قلب کے غلاف میں ہوتی ہے، گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے، لیکن محبت جب قلب کے گرد و نواح میں آجاتی ہے، تو پھر گناہ صادر نہیں ہوتا، اہلِ محبت کے دل میں نماز کے

وقت دنیا کا خیال آجاتا ہے، تو وہ پھر سے نماز پڑھتے ہیں، اور اگر عاقبت کا خیال آجاتا ہے، تو سجدۂ سہو بجالاتے ہیں۔ (افضل الفوائد)

صبر، رضا، توکل | اس راہ میں صبر، رضا، اور توکل لازمی چیزیں ہیں، بلا اور مصیبت کے وقت شکایت نہ کرنا صبر ہے، اور بلا اور مصیبت کے وقت اپنی کراہت کا اظہار نہ ہونے دینا رضا ہے، جو بظاہر ناممکن الفعل معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں، مثلاً تیز رو مسافر کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے، تو وہ کانٹے کا خیال کئے بغیر اپنی راہ طے کرتا چلا جاتا ہے، یا ایک سپاہی جنگ میں مشغول ہوتا ہے، تو پھر اس کو اپنے زخم کا خیال مطلق نہیں ہوتا، (فوائد الفواد ص ۵۳) توکل کی تین قسمیں بتائی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے حال کا عالم و دانا سمجھ کر اس سے سوال کرے، دوسرا توکل بچوں کا ہے، کہ وہ ماں سے دودھ نہیں مانگتا ہے لیکن پھر بھی اس کو دودھ مل جاتا ہے، تیسرا توکل مردوں کا ہوتا ہے وہ اپنے غسالوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جس طرح غسال چاہتے ہیں، ان کو غسل دیتے ہیں، محبوب الٰہی کے نزدیک سب سے اعلیٰ توکل یہی ہے، (فوائد الفواد ص ۵۴) فرمایا کہ ایک شخص کا ایمان مکمل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو اونٹ کی مینگنی کے برابر سمجھتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور پر اعتماد نہ کرتا ہو، (فوائد الفواد ص ۱۰۱) جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی دوستی کا دعویٰ کرتا ہے، اور اسی کے ساتھ دنیا کی دوستی بھی رکھتا ہے، وہ کاذب ہے (فوائد الفواد ص ۵۸) عارف کے ستر مقامات ہیں ان میں سے ایک اس دنیا کی مرادوں سے محرومی ہے، لیکن اگر وہ اپنے کو نیک اور اچھا انسان سمجھنے لگے، اور اس میں رعونت پیدا ہو جائے، تو وہ بدترین آدمی ہے، (فوائد الفواد ص ۲۱۶)

بنیاد حق | سالک کے لئے یاد حق کی بنیاد چھ چیزوں پر ہے:۔

(۱) وہ خلوت نشین ہو کہ اس سے اس کا نفس مغلوب ہوگا، (۲) وہ ہمیشہ باوضو رہتا ہو، اگر اس کو نیند آجائے. تو جاگنے کے بعد پھر وضو کرلے، (۳) صوم دوام رکھنے کی کوشش کرتا ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو غذا میں تقلیل کرے (۴) غیر حق سے ہمیشہ سکوت اختیار کرتا ہو، (۵) شیخ سے قلبی لگاؤ اور محبت رکھتا ہو، (۶) حق کی خاطر تمام خواطر کی نفی کردیتا ہو۔

سالک کا پرہیز | ایک دوسرے موقع پر فرمایا. کہ سالک کے لئے چار چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے. (۱) دنیا خصوصاً صحبت اغنیاء (۲) ماسوی اللہ کا تذکرہ (۳) غیر اللہ کی طرف التفات و توجہ، (۴) دل کا میل یعنی دل میں دنیا کی کسی قسم کی محبت نہ ہو، (افضل الفوائد نسخہ قلمی ص ۷)

توبہ | ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ سالک جب کسی چیز سے توبہ کرے تو اس کی نیت خالص ہو (فوائد الفواد ص ۲۵) اور ہر حال میں اس پر ثابت قدم رہے، (فوائد الفواد ص ۷، ۵۔ ۱۳۹۔ ۱۰۵) گناہ سے ایک مرتبہ توبہ کی جاتی ہے، مگر طاعت سے ہزار مرتبہ، جس طاعت میں ریا کی آمیزش ہو، وہ گناہ سے بھی بدتر ہے،

ظاہری اخلاق | حضرت محبوب الٰہیؒ نے سالک کے ظاہری اخلاق پر بھی پورا زور دیا ہے، فرماتے ہیں کہ سالک میں چار چیزوں سے کمال پیدا ہوتا ہے، (۱) کم کھانا (۲) کم بولنا (۳) کم سونا، اور (۴) لوگوں سے میل جول کم رکھنا،

حقوق العباد | مخالطت خلق سے پرہیز کی تاکید جابجا ہے، مگر اسی کے ساتھ خلق اللہ کے حقوق کی بھی تعلیم ہے. فرمایا کہ مومن کے دل کو ستانا اللہ تبارک و تعالیٰ کو تکلیف

پہنچانا ہے، مومن وہ شخص ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہے اور مغرب میں ایک مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو اس کو یہاں درد محسوس ہو۔ (افضل الفوائد قلمی نسخہ)

عیب پوشی۔ اور درویش کو جب کسی سے تکلیف پہنچے تو اس کے دل سے کسی حال میں بھی بد دعا نہ نکلے، اور درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیے، پردہ پوشی تمام عبادتوں میں افضل ہے، (افضل الفوائد قلمی نسخہ)

حقوق ہمسایہ | ہمسایہ کے حقوق کے سلسلہ میں فرمایا، وہ قرض مانگے تو اس کو قرض دو، اس کو کوئی ضرورت ہو تو پوری کرو، بیماری میں اس کی عیادت کرو، مصیبت میں غمخواری کرو، اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی میت کے ساتھ جاؤ، اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھو۔ (افضل الفوائد قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۲۹)

پابندی شریعت | شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری بتائی ہے، اپنے خواجگان ہی کی طرح فرماتے ہیں، کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے تو شروع میں گرے اور اگر یہاں سے گر گیا تو پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں، ایک اور موقع پر فرمایا کہ اپنچہ نا مشروع ست ناپسندیدہ است یعنی جو شے شرعاً ناجائز ہے۔ وہ بری ہے (فوائد الفواد ص ۲۴۰) وجد و حال، ذوق و کیف اور استغراق و تحیر سے شریعت ساقط ہو جاتی تو اس کو کسی حال میں گوارا نہیں فرماتے ارشادات عالیہ میں ہے کہ وہی لوگ مشائخ ہیں، جن کے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہیں۔ (فوائد الفواد ص ۱۳۴) اسی لئے ملفوظات میں ذوق و کیف اور استغراق و تحیر کے ساتھ نماز، روزہ، سنن و نوافل، تلاوت قرآن پاک، تراویح، احترام شریعت، اور اتباع سنت کی جا بجا تاکیدیں ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کی بڑی تاکید کی ہے، فرمایا کہ

"اگر دو کس باشند ہم جماعت باید کرد چہ از دو کس جماعت باشد، اما ثواب جماعت باشد، آن دو تن را باید کہ برابر ایستند" (فوائد الفواد ص ۱۰۱)

خود بھی جماعت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ضعیفی اور کبر سنی کے باوجود آخر وقت تک نماز باجماعت کے لئے خانقاہ کے کوٹھے سے نیچے تشریف لاتے، جمعہ کی نماز کے متعلق ارشاد ہے کہ مسافر اور مریض کے علاوہ اگر کوئی شخص ایک جمعہ کی نماز میں شرکت نہیں کرتا، تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر دو جمعہ ناغہ کرتا ہے تو دو سیاہ نقطے پیدا ہو جاتے ہیں، اور تین جمعہ کی عدم شرکت سے اس کا تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے، (فوائد الفواد ص ۱۳۱)

پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت بابا گنج شکرؒ نے حضرت محبوبؒ الٰہی کو نصیحت فرمائی تھی کہ راہ سلوک میں روزہ رکھنا نصف راہ ہے، اور بقیہ نصف راہ نماز اور حج سے طے ہو جاتی ہے، حضرت محبوبؒ الٰہی نے اسی کی تعلیم اپنے مریدوں کو دی، اس کے علاوہ اپنی مجلسوں میں احکام الٰہی کی تلقین زیادہ تر کلام الٰہی کی تفسیر کے تحت فرماتے، احادیث نبویؐ کی بھی بڑی تعظیم کرتے، ایک موقع پر فرمایا کہ وہ ملک کیونکر آباد رہے گا، جس میں لوگوں کی رائے کو احادیث نبویؐ پر ترجیح دی جاتی ہو،

اظہار کرامت | کرامت کے اظہار کی ممانعت سختی سے کی ہے، فرمایا کہ

"کرامت پیدا کردن کارے نیست مسلمانے روی راستی گدائے بیچارہ می باید بود"

اسی کے ساتھ یہ حکایت بیان کی کہ ایک بار خواجہ ابو الحسن نوریؒ دجلہ کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ ایک ماہی گیر دریا میں جال ڈال رہا ہے، خواجہ ابو الحسن

نوائی نے ماہی گیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر میں صاحب ولایت و کرامت ہوں گا، تو تمہارے جال میں میرے کہنے سے ڈھائی من وزن کی ایک مچھلی پھنسے گی، اور مچھلی ٹھیک اسی وزن کی ہوگی۔ نہ کم ہوگی، نہ زیادہ۔ ان کے ارشاد کے مطابق واقعی اس وزن کی مچھلی پھنس گئی۔ اس کی خبر حضرت شیخ جنید قدس سرہٗ کو ملی تو انھوں نے فرمایا کاش اس جال میں ایک مار سیاہ پھنستا، اور ابوالحسن کو کاٹ لیتا کہ وہ ہلاک ہو جاتے لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں، جواب دیا کہ اگر سانپ انکو کاٹ لیتا تو وہ شہید ہو جاتے لیکن اپنی کرامت کے بعد زندہ ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ انکا خاتمہ کس طرح ہوا، (فوائد الفواد ص ۱۷۳)

ڈاکٹر مظہر یٰسین صدیقی ندوی

ملفوظات کا اسلوب

ہر موضوع اپنا اسلوب خود مقرر کرتا ہے بلکہ ہر مضمون اپنی زبان بھی طے کرتا ہے۔ مذہبیات و دینیات کی زبان بھی مختلف ہوتی ہے اور اسلوب بھی۔ پھر ان کی ذیلی شاخوں کی زبان و بیان میں بھی اختلاف و فرق ہوتا ہے۔ اسلامی دینیات میں قرآن کریم کا زبان اور اس کا اسلوب الہامی ہے لہٰذا وہ دونوں عربی زبان و ادب میں نہ صرف نئے بلکہ ناقابلِ تقلید و پیروی ہیں۔ الفاظ و عبارات ان کی نشست و برخاست فقرے و کلمے میں ان کی آمیزش، آیت کے مختلف اجزاء کا باہمی تعلق، قافیہ و ردیف کے بغیر آہنگ و موسیقیت، ایک آیت کا دوسری سے ارتباط، چھوٹی سورت میں آیات کی ترتیب و تنظیم، آغاز و انجام کی تمام کڑیوں کی ایک دوسرے سے مربوطی اور ایسے ہی متعدد دوسری لفظیات اسے ایک خاص طرز ادا عطا کرتے ہیں۔ اسی طرح فکر و نقد، مغز و روح اور معنی و مفہوم اس کے اسلوب کی تعیین میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چونکہ کلام الٰہی کتاب ہدایت کی صورت دلپذیر میں جلوہ گر ہوا ہے لہٰذا اس کا ہر فقرہ، ہر کلمہ اور ہر جملہ بلکہ ہر لفظ ہدایت و ارشاد اور نصیحت و رہنمائی کا رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ فکری اور معنوی زیریں لہر جو الفاظ و عبارات کی تہہ میں کام کرتی ہے اس کا الفاظ و عبارات کی تعیین اور اسلوب و طرز ادا کی تشکیل میں بنیادی ساختیاتی تاثیر کا کام کرتی ہے۔ حدیث و فقہ، کلام و تصوف، عقیدہ و فلسفہ، ادب و لغت غرضیکہ ہر موضوع و مضمون کا اسلوب اس کے لفظیات اور ان کی معانی کی باہمی تاثیر و اثر پذیری کے تشکیلی عمل اور تعمیری کارفرمائی سے وجود میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ مشخص ہوتا ہے۔

آغازِ ملفوظات

اسلامیات میں ملفوظات کا آغاز حدیثِ نبوی سے ہوتا ہے۔ اصطلاحی اور تکنیکی اعتبار سے اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، تقریر، قول، عمل اور حلیہ اور اسلوب و لفظیات کے اعتبار سے خطبہ، موعظت، پند و نصیحت، سوال و جواب، مکالمہ و مسئلہ وغیرہ لیکن خالص ملفوظات کے خانے میں وہ ارشاداتِ نبوی آتے ہیں جو آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی مجالسِ عالیہ میں اپنی زبانِ مبارک سے ادا فرمائے تھے۔ قرآنی اور حدیثی موضوعات و مضامین چونکہ اپنے مقصد و منہاج میں مشترک بلکہ یکساں ہیں اس لیے ان کا فکری اور معنوی ارتفاع تو ایک جیسا ہے، لیکن حدیث شریف الہامی ہونے کے باوجود لفظیاتِ بشری ہیں اس نے ان کا اسلوب قرآنِ مجید سے یکسر مختلف ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلامِ نبوی کا کلامِ الٰہی سے تعلق موثر اور تاثیر شدہ کا ہے کہ حدیث پر قرآن کا اثر ہے مگر ان کے اسالیب کے ہر لحاظ سے مختلف ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اپنے اپنے میادین اور دائروں میں ان کے مختلف موضوعاتی حصوں میں ذیلی اسالیب کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ملفوظاتِ نبوی میں جو رنگ و آہنگ فقہی اور تشریعی مضامین کا پایا جاتا ہے وہ تہذیبی و تادیبی لفظیات سے مختلف ہے۔ پند و نصیحت پر مبنی کلامِ نبوی میں جو طرزِ بیان ہے وہ قصہ کہانی میں نہیں ملتا۔ خواب اور اس کی تعبیر کے بیان میں جو طریقۂ ادا اپنایا گیا ہے وہ حقیقت و واقعیت کی تعبیر و تشریح سے مختلف ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کریم کے متنوع اسالیب کی طرح حدیث نبوی اور اس کے ملفوظاتِ سامی کے گوناگوں اسالیب ہیں۔

ملفوظات کا فنی موضوعاتی دائرہ

اسے تاریخی بوالعجبی کہیے یا تہذیب کی ستم ظریفی، یا اسے بشری فطرت کی ستم گری گردانیے کہ ملفوظات کو صرف تصوف و صوفیت سے وابستہ و مربوط ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسی میں محدود و محصور کر دیا گیا۔ ملفوظات کا دائرہ کار اور میدانِ عمل بہت وسیع اور کثیر الجہات ہے۔ اسلامی امت و معاشرہ کے

کے مختلف افراد و طبقات کے ملفوظات بھی اس نوعِ ادب میں شامل ہیں جن کی طرف ہمارے اہلِ قلم اور صاحبانِ فکر کی نظر نہیں کی گئی اور اگر گئی تو اس کی تشخیص، تشکیل اور تعیین کی کوشش نہیں کی گئی۔ چنانچہ آج ملفوظات سے صرف تصوفی ادب ہی مراد لیا جاتا ہے۔ دوسرے انواعِ ملفوظات کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا۔ حالانکہ حدیثِ شریف سے ملفوظاتِ اسلامی کی جو داغ بیل پڑی تھی وہ تمام ادوار میں برابر جاری ساری رہی۔ حضرات صحابۂ کرام، تابعین عظام اور دوسرے سلفِ صالحین کے کلام اور مجلسی ادب میں اس کے واضح نشانات ملتے ہیں جن پر دورِ متوسط کے بزرگانِ کرام اور علماء و صوفیا اور دوسرے اہلِ ہنر و فن نے اپنے اپنے ملفوظات کی عمارت تعمیر کی۔ چونکہ صوفیائے کرام بالخصوص قرونِ وسطیٰ کے صوفیہ کے ملفوظات کو باقاعدہ مرتب و مدون کیا گیا اس لیے ترتیب و تدوین کے لحاظ سے ان کا پلڑا بھاری ہوتا چلا گیا اور دوسرے طبقات و افراد کا ہلکا۔ جدید دور میں علماء، مفکرین، مصلحین، حکماء، شعراء، اور متعدد دوسرے اصحابِ فکر و نظر کے ملفوظات کو محفوظ و مرتب کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ انھیں اسباب و عوامل کی بنا پر ملفوظات کے اسلوب یا اسالیب پر فنی کلام بھی کیا گیا ہے۔

انواعِ ملفوظات کی تعیین

ملفوظات چونکہ مجلسی کلام کی ایک شاخ اور تہذیبی گفتگو کی ایک صورت کا نام ہے اس لیے مجلس کا رنگ و روپ بھی اس کی نوعیت متعین و مشخص کرتا ہے جس طرح صاحبانِ مجلس کا علم و فن، تعلیم و تربیت، فکر و نظر، رجحانِ طبع اور میلانِ فطرت اس میں حصہ لیتا ہے۔ ان کے موضوعات و مضامین بھی مختلف ہوتے ہیں جو اسالیب کے تنوع یا اختلاف کی صورت بناتے بگاڑتے یا سجاتے سنوارتے ہیں۔ یہ حقیقت اس طرح زیادہ واضح اور اجاگر ہوتی ہے جب ہم مختلف اصحابِ فکر و نظر کے ملفوظات کا جائزہ لیتے ہیں۔

حدیثی ملفوظات کا دائرہ چونکہ میادینِ حیات کی طرح وسیع ہے اس لیے ان میں ہر طرح کا موضوع و مواد شامل و داخل ہوتا ہے۔ قانون و شریعت، ہدایت و نصیحت، احکام و اوامر، ہدایات

وتادیبات، عبرت وموعظت، قصہ وکہانی، تاریخ وتفسیر، اقتصادی وسیاسی مسائل اور اسی طرح کے تمام دوسرے موضوعات، مذکرین کرام اور واعظین عظام کے ہاں تذکیر اور پند وموعظت کا عنصر سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کا مذاق تصوف کے تقاضوں سے تعمیر وتشکیل ہوتا ہے لہٰذا ان کے ملفوظات میں تصوف وطریقت اور صوفیائے سلف کے طرق ہدایت وارشاد پر زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ علماء کرام پر علم وفن کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان کے ملفوظات میں علمی مباحث زیادہ آتے ہیں اور ان کے محققین عظام کے یہاں علم وفن کی تحقیقات وتخلیقات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ فقہائے کرام پر قانونِ اسلامی اور اصول تشریعی زیادہ محیط ہوتے ہیں لہٰذا وہ قانون وتشریع اور استنباط سے بحث کرتے ہیں۔ اسی طرح مفسرین کرام تفسیر قرآن سے، محدثین عظام حدیث وسنت سے ادباء گرامی ادب وزبان ولغت سے، شعراء عصر شعر وسخن اور اس کے مقتضیات سے زیادہ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ ان متخصصانِ فن اور ماہرین علم کے ملفوظات دوسرے پہلوؤں سے قطعی عاری ہوتے ہیں۔ ان کا اختصاص ومہارت اپنی جگہ، لیکن وہ زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں جو وسعت اور تنوع کی عادی اور متقاضی ہے اس لیے ان کے ملفوظات میں دوسرے دائروں اور قانون کے رنگ بھی ملتے ہیں گوناگونی اور تنوع کے لحاظ سے ہمہ جہت شخصیات اور عبقری نفوس کے ملفوظات کی موضوعاتی حدبندی مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی فکر ونظر زندگی کے ہر پہلو اور حیات کے ہر زاویہ پر رہتی ہے۔ ان کے ہاں ادب ولغت، علوم وفنون، معاشیات وسماجیات، آرٹ اور فن تعمیر، طنز وظرافت، سیاسی زندگی، قوم وامت، تحریکات وشخصیات، افراد وجماعت غرض کہ ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ان سب کے اسالیب بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔

تعیین موضوعات میں حاضرین مجلس کا حصہ

مجلسی علم، تہذیبی کلام اور محفلی گفتگو ہونے کے سبب ملفوظات کے مضامین وموضوعات کی تعیین میں کسی نہ کسی حد تک سامعین وحاضرین کے تہذیبی پس منظر، علمی اساس، فنی نوعیت،

تربیتی انداز اور ان سے متعلق دوسری چیزوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موضوعات میں سامعین کا بھی حصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی گفتگو، سوال، بحث سے اس کی تشخیص و تعیین میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر ایسا صرف دو طرفہ ملفوظات میں ہوتا ہے جہاں سوال و التماس اور بحث کی اجازت ہوتی ہے لیکن یک طرفہ ملفوظات میں جہاں سوال جواب کی گنجائش نہیں ہوتی اور صرف صاحب ملفوظات کلام اور سامعین صرف سنتے ہیں وہاں مباحث و موضوعات کی تعیین سراسر صاحب ملفوظات کی اپنی ہوتی ہے۔ ایسے یک طرفہ موضوعاتی ملفوظات بالعموم شیوخِ وقت، اکابر عصر، صوفیائے دہر اور ان تمام افراد و طبقات کے ہوتے ہیں جن کی تقدیس و تحریم، احترام و اکرام و عظمت و سرفرازی یا ان کے سامعین و حاضرین کی بے انتہا عقیدت، بے پایاں محبت اور بیکراں تعظیم لب کھولنے میں مانع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صاحب ملفوظات کا خوف و خفگی اور سامعین کی دہشت و خوفزدگی بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔ دو طرفہ ملفوظات میں صاحب و سامع کی شراکت کا سبب مجلس کا کھلاپن تو ہوتا ہی ہے ان دونوں کی علمی اور تہذیبی شراکت بھی ایک اہم وجہ ہوتی ہے۔ اگر صاحب علم، فقیہ، ادیب، شاعر، حکیم یا کوئی ہمہ جہت شخصیت ہے تو سوال و جواب یا بحث یا مباحثہ کا دروازہ کھل جاتا ہے جس طرح سامع کے صاحب علم و فضل ہونے سے اس کے وا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

صاحب تدوین و جامع ملفوظات کا طریقہ

موضوعاتِ ملفوظات کی تشخیص و تعیین میں تدوین، صاحب تدوین اور اس کے طریقہ کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ اول یہ کہ اگر صاحب تدوین عالم فاضل اور مہذب فرد ہے تو وہ موضوعات و مضامین پر اچھی گرفت رکھتا ہے اور ملفوظات کو ان کے پس منظر و پیش منظر میں پیش کرتا ہے اسی طرح اگر اس کی نظر وسیع اور قلب کشادہ ہے تو وہ صاحب ملفوظات کے لب و چہرہ کے علاوہ سامعین و حاضرین کے لب و ذہن پر نگاہ رکھتا ہے اور ان دونوں کے اشتراک سے جو ملفوظات وجود میں آتے ہیں ان کو جمع اور مرتب کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کی نظر صرف صاحب ملفوظات ہی کے چہرے پر جمی رہتی ہے اور گردوپیش سے بے خبر تو وہ یک طرفہ اور ناقص ملفوظ پیش کرتا ہے اس سے زیادہ

خطرناک اور خوفناک صورت حال وہ ہوتی ہے جہاں جامع ملفوظات و مرتب ارشادات صرف صاحب و مرشد کی شخصیت سازی کا کام کرنے لگتا ہے کہ اس کا مقصد منظور نظر و قبلۂ نگاہ کی تقدیس و عظمت کے گن گانا اور شخصیت کو اس کے اصل خاکہ سے بڑا بنا کر دکھانا ہوتا ہے۔

تدوینِ ملفوظات کے مختلف طریقے

احادیثِ نبوی کو اگر اولین مجموعۂ ملفوظات تسلیم کر کے تجزیہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ان کے مجموعوں کی ترتیب و تدوین میں فقہی تبویب کا اثر رہا تو وہ اکثر و بیشتر جوامع کا روپ دھار گئے۔ مسانید میں صحابۂ کرام کی الگ الگ احادیث کو ایک معہود ترتیب سے جمع کیا گیا سنن کا انداز احکام شریعت کی رعایت سے متعین ہوا۔

صحابۂ کرام اور دوسرے سلفِ صالحین کے ملفوظات کے مجموعوں کی تدوین کی طرف توجہ ذرا کم گئی لہٰذا ان کے ارشاداتِ گرامی کو بالعموم ان کی کتبِ سیر و سوانح اور تراجم میں ان کے "کلام" یا "اقوال" کے عنوان سے مرتب کر دیا گیا اور اس میں کسی ترتیب و ارتباط کا خیال نہیں رکھا گیا۔ سیرت و حیات کی کتابوں میں ایسے ملفوظات ملتے ہیں اور ان میں ملفوظات کی فضا یا مجلس کا حوالہ نہیں ملتا۔ وہ مجرد کلام اور منفرد اقوال کی فہرست نگاری میں آجاتے ہیں۔

سب سے زیادہ مرتب و منظم ملفوظات قرونِ وسطیٰ میں حضرات صوفیاء کے ملتے ہیں۔ وہ مجالس مورخہ کے عنوان سے مدون کیے گئے ہیں یعنی ہر روز اور تاریخ کی مجلس شیخ کے ملفوظات کو جامع اپنے انداز سے اپنے الفاظ میں مرتب کر دیتا ہے۔ ان میں غالباً سب سے اہم مجموعہ ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ ۶۳۶ھ ۱۳۲۵-۱۲۳۸ء) کے ملفوظات و ارشادات کا ہے جسے ان کے مرید و مسترشد امیر حسن علاء سجزی دہلوی (۷۳۸-۶۵۵ھ ۱۳۳۷-۱۲۵۷ء) نے فوائد الفواد کے عنوان سے جمع کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جامع و مرتب نے بالفاظ خویش و اعتراف خود ان کو مرتب کرنے کے بعد ان کو حضرت شیخ کے سامنے پیش کر کے ان کے مندرجات کی تصویب کرائی تھی۔ (مجلس ۲۸ مقدمہ مرتب ص ۵) جبکہ ملفوظات کی غالب اکثریت کو ایسی خوش بختی نہیں حاصل ہو سکی، وہ صاحب ملفوظات کی نظر تصحیح و سند قبول سے محروم ہی رہی۔

فوائد الفواد کا طریقۂ جمع و تعیین موضوعات

جامع ملفوظاتِ شیخ نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں کل ۱۸۸ مجالس کا ذکر کیا ہے جو ان کی عمرِ آخریں کے پندرہ برسوں کے ملفوظات پر مشتمل ہیں اور جن کی آخری مجلس کی تاریخ ۱۸ شعبان ۷۲۲ھ ہے اور اولین مجلس کی ۳ رشعبان ۷۰۷ھ۔ (فوائد الفواد ص ۴۲۹ ص ۱ امیر حسن سجزی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دن تاریخ ذکر کرنے کے بعد اپنے مرشد کی مجلس میں اپنی آمد، حضرت خواجہ سے ملاقات اور پھر ان کے مجلسی ارشادات کا ذکر کرتے ہیں۔ بالعموم ہر مجلس کا بیان مختصر ہوتا ہے اور بعض بعض کا کچھ نسبتاً مفصل۔ ملفوظاتِ شیخ کا بیان کبھی تمہید کے بغیر شروع کر دیتے ہیں اور کبھی بعض تمہیدی چیزوں کا ذکر لاتے ہیں جیسے حضرت خواجہ کی مزاج پرسی، ان کی نظرِ شفقت، بعض نئی قسم کے سوال و جواب۔

ملفوظات کا خاکہ یا موضوعاتی دائرہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کے کسی ارشاد کو مختصراً نقل کرتے ہیں پھر دوسرے ارشاد کو نقل کرنے سے قبل یہ فقرہ اکثر و بیشتر لاتے ہیں کہ اس موضوع پر سخن شیخ آیا، اسی سے متعلق بالعموم کوئی نہ کوئی حکایت ہوتی ہے اور پھر دوسری حکایت اور تیسری حکایت وغیرہ۔ ان حکایات کا تعلق کسی موضوعِ خاص سے ہوتا ہے یا الگ الگ موضوعات و نکاتِ تصوف سے۔ مثلاً مجلسِ اول کا موضوعاتی دائرہ یہ ہے: یک شنبہ سوم ماہ مبارک شعبان ۷۰۷ھ، مجلس شیخ میں حاضری جامع، حضرت خواجہ کی نماز و روزہ کا بیان، فرمودات ۱ تائب و متقی دونوں برابر ہوتے ہیں ۲ مردانِ خدا خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں مگر حق تعالیٰ ان کو ظاہر فرما دیتے ہیں، خواجہ ابوالحسن نوری کا واقعہ متعلقہ، ۳ حمید الدین سوالی کی حکایت کہ بعض تو بعد وفات مشہور ہو جاتے ہیں اور بعض مشہور نہیں ہوتے اور اس کی غایت و وجہ، ۴ مشائخِ کبار کی ترقیٔ درجات اور ابدال پر ان کی فوقیت اور اسی سے متعلق حضرت شیخ عبد القادر گیلانی کا واقعہ و حکایت، ۵ "ادبِ پیر و حسنِ جواب در نظرِ پیر" سے متعلق خواجہ جنید بغدادی کی حکایت ۶ تزکیہ پر ارشادِ شیخ کہ "کمالِ مرد" چار چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ۷ جد و اجتہاد پر کلام شیخ اور دو شعر۔ اسی پر مجلس ختم ہوتی ہے اور خاتمہ کا اعلان و سبب نہیں

مذکور ہوتا ہے۔ مجلسِ دوم میں صرف ایک نکتہ اور اس سے متعلق حکایت ہے۔ مجلسِ سوم میں شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ فرید الدین کی مجالس کے حاضرین وسامعین کے طبقات کا فرق اور "عامی خاصی" کی رعایت سے حکایت بیان کرکے دوسری حکایت بیان کی ہے۔ مجلسِ چہارم میں شیخ و جامع کے مابین نمازِ وتر، صیامِ ایامِ بیض، نمازِ چاشت، نمازِ سعادت کے بارے میں سوال وجواب ہے کہ ادا کرتے ہو یا نہیں (ص ۸-۱)۔ مجالس کا یہی رنگ از اوّل تا آخر رہتا ہے۔

امیر خسرو دہلوی (۶۵۱-۷۲۵ھ/۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) کے ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء۔ افضل الفوائد۔ کا انداز تالیف وتدوین فوائد الفواد کا سا ہے کہ وہ مجلس وار ملفوظات مرتب کرتے ہیں اور تاریخ ویوم وار۔ اور ہر مجلس کے ملفوظات کو اندرونی ترتیب وتنظیم میں موضوعات کے مطابق۔ ان کی مجالس میں بالعموم زیادہ طویل ملفوظات ملتے ہیں۔ اور ان میں مختلف مسائل وامور کا ذکر ایک ہی مجلس کے حوالے سے ہوتا ہے۔

سید جلال الدین مخدوم جہانیان (۷۰۷-۷۸۵ھ/۱۳۰۷-۸۴ء) کے ملفوظات کا انداز بھی یہی ہے کہ دن وتاریخ وار ملفوظات کو جمع ومرتب کیا گیا ہے۔ اگرچہ مجالس کا ذکر نہیں تاہم ہے اسی کے تحت۔ البتہ ملفوظات کو عنوان وموضوع وار مختلف حصوں میں مرتب کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہی مجلس کی باتیں تھیں۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی اوشی (۶۳۳ھ/۱۲۳۴ء) کے ملفوظات فوائد السالکین (مرتبہ شیخ بابا فرید الدین گنج شکر) اور موخر الذکر بزرگ گرامی (۶۷۰ھ/۱۲۷۰ء) کے ملفوظات اسرار الاولیاء (مرتبہ مولانا بدر الدین اسحاق) اور راحت القلوب (مرتبہ شیخ نظام الدین اولیا اور دوسرے چشتی بزرگوں کے ملفوظات کا اندازِ تدوین اسی نوعیت کا ہے۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے ملفوظات کو حمید قلندر نے خیر المجالس (تالیف ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) کے عنوان سے اسی انداز سے مرتب کیا۔ ان کے مرید وخلیفہ سید محمد گیسو دراز (۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء) کے ملفوظات جوامع الکلم، شیخ برہان الدین غریب (۷۴۱ھ تقریباً/۱۳۴۰ء) کے ملفوظات احسن الاقوال مرتبہ حماد بن عمار کاشانی اور متعدد دوسرے ملفوظات میں تقریباً ایک جیسا طریق تدوین

ملتا ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، مقالہ "چشتیہ" و تراجم صوفیہ)۔

برصغیر میں دور جدید کے ایک عظیم ترین عالم وصوفی اور صاحب قلم و دل حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۱۳۶۳-۱۲۸۰ھ = ۱۹۴۳-۱۸۶۳ء) کے ملفوظات عالیہ کے کئی مجموعے مرتب کیے گئے۔ ان میں سے بعض حالات و واقعات و تاثرات کے ضمن میں بھی ملفوظات رکھتے ہیں جیسے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا مجموعہ حالات و نقوش جو مکتوبات شیخ پر زیادہ مبنی ہے۔ البتہ مجالس الحکم میں جامع بجنوری نے مولانا تھانوی کے ملفوظات کو مجلس کے پس منظر میں جمع کیا ہے۔ بعض دوسرے مجموعے صرف ملفوظات پر حاوی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر مجلسی فضا اور سیاق و سباق ملفوظات سے آراستہ ہوتے ہیں اور دوسرے عاری۔ مولانا دریا آبادی ان کے ملفوظات کے موضوعات یوں بیان کرتے ہیں: "باتیں وہی ریتی جو ان کے سے حکیم و مصلح شفیق کے شایان شان تھیں۔ اکثر اپنے بزرگوں، استادوں کے قصے اور حکایتیں نقل کرتے، اور ان ہی کے ضمن میں سب کچھ کہہ جاتے۔ حدیث پر تو کم، تفسیر پر گفتگو نسبتاً زیادہ رہتی۔ اور ان دونوں سے بڑھ کر فقہ اور تصوف کے موضوع چلتے رہتے ... (ص ۲۱۵) مگر دریا آبادی کے ہاں ملفوظات بہت کم ہیں۔ اصل ملفوظات حضرت تھانوی خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے ہیں جن میں زیادہ تر مجلس کی فضا کم ہے اگرچہ کہیں کہیں ہے۔ ورنہ ملفوظات نمبروار بغیر سیاق کے مرتب کیے گئے ہیں۔ مولانا محمد الیاس کے ملفوظات مرتب کرنے میں مولانا محمد منظور نعمانی نے صرف ملفوظات پر دھیان دیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت مجددی کے ملفوظات میں مجلس اور سیاق و سباق کا پس منظر نہیں دیا ہے اور موضوعات کے اعتبار سے ملفوظات کو جمع کر دیا ہے۔

ملفوظاتِ اقبال کے طرقِ تدوین

حکیم الامت حضرت اقبال صوفی نہ تھے نہ روایتی عالم۔ وہ جامع الحیثیات شخصیت اور عبقری مفکر و دانشور تھے۔ ان کے ملفوظات کے کئی مجموعے ان کی وفات کے بعد مرتب کیے گئے جن کا مواد ان کی زندگی ہی میں جمع کر لیا گیا تھا یا جامعین کے یہاں خانہ دل اور پنہاں درجہ دماغ میں موجود تھا۔ ان کے تمام مجموعہ ہائے ملفوظات کا طریقۂ تدوین مختلف ہے۔

سید نذیر نیازی کے مجموعۂ ملفوظات "اقبال کے حضور" میں پہلے ہی یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ ملفوظات جنوری تا ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کی مدت پر محیط ہیں۔ ہر مجلس کا ذکر دن اور تاریخ سے شروع ہوتا ہے جو بطور عنوان سرِ مجلس ہوتا ہے۔ مجلس کا بیان جامع کی حاضری سے ہوتا ہے۔ پھر اس میں حضرت علامہ کی حالت و کیفیت، بیماری و آزاری، مزاج پرسی، خبر و حالات کی پرسش، تازہ ملی قومی خبروں و مسئلوں پر بحث جامع کے خیالات اور دوسرے سامعین و حاضرین کی شراکت، پھر بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں اسلام مسلم شخصیات، تحریکات، اور دوسرے مسائل و موضوعات پر گفتگو اور حضرت علامہ کے ارشادات آتے ہیں۔ نیازی کے جمع کردہ ملفوظاتِ حکیم الامت میں ایک پوری فضا ملتی ہے اور ملفوظات ایک تسلسل، ربط اور بحث کی لڑی میں پروئے نظر آتے ہیں۔ اور ایک بحث سے دوسری اور تیسری اور اسیطرح مختلف بحثیں جڑی ہوئی ہیں، اسیطرح مختلف موضوعات پر ارشادات ملفوظاتِ حضرت علامہ بھی۔

حضرت علامہ کے ملفوظات کی ایک دوسری تدوین روزگار فقیر اور جواہر ریزوں وغیرہ میں نظر آتی ہے جہاں ایک ارشاد و ملفوظ کو ایک خاص عنوان کے تحت بطور لطائف ظرائف جمع کیا جاتا ہے۔ ایسی تدوینوں میں نکتہ زیر بحث کا پس منظر اور سیاق سباق تو ہوتا ہے مگر مجلس کی فضا مفقود ہوتی ہے۔ ان میں مجلس کا ذکر ہی تقریباً نہیں آتا۔ بالعموم ان مجموعوں میں ملفوظات کا حصہ بہت کم ہوتا ہے اور زیادہ تر جامع کا بیان اور پس منظر ہوتا ہے۔ تقریباً اسی انداز کے ملفوظاتِ علامہ دوسرے مجموعوں یا مضامین میں ملتے ہیں۔ بعض سوانحی مضامین میں بھی حضرت اقبال کے ملفوظات کا ذکر مختصراً آجاتا ہے۔ اسی طرح مکاتیب غیر ملفوظی تحریروں میں بھی ملفوظات کا بیان ملتا ہے۔

دوسرے ملفوظات

دیگر علماء فضلاء اور صاحبانِ علم و معرفت کے ملفوظات کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو ملفوظاتِ اقبال کی دوسری نوعیت کی ہے کہ وہ مجلس کی فضا کے بغیر یا تو جامع کی تمہید کے ساتھ یا اس کے جلو میں ملفوظات آتے ہیں یا جامع براہ راست صرف ملفوظات ہی کو نقل

کرتا چلا جاتا ہے۔کبھی کبھی ان میں ایسا ہوتا ہے کہ دن تاریخ، موقعہ محل اور دوسرے تعارفی تمہیدات کا ذکر نہیں ہوتا۔

دورجدید میں جن بزرگانِ امت کے ملفوظات جمع کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے ان میں صوفیا، علما، اور جماعت کے سربراہ بھی شامل ہیں مؤخرالذکر طبقہ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۳۲۱-۱۴۰۰ھ / ۱۹۰۳-۷۹ء) کے ملفوظات کو ان کی عصری مجالس کے حوالہ سے ۵۔اے ذیلدار پارک کے عنوان کے ساتھ مرتب ومدون کیا گیا ہے۔ان میں سنہ وار مجالس اور ان کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں۔اور ان کی تاریخیں ترتیب کی بنیادی وجہ ہے۔مولانا مرحوم کے ملفوظات میں دنیا جہان کے معاملات ومسائل پر اظہار خیال ملتا ہے۔ان کے جامعین مختلف تھے لیکن ان کا طریقہ کار یکساں ہے۔وہ ہر مجلس کا پس منظر اور تمہیدی تعارفی حصہ پیش کرنے کے ذریعہ مجلس کی فضا بیان کرتے ہیں اور بالعموم مولانا کے ملفوظات سوال وجواب کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں ایسا کم ہوا ہے کہ مولانا نے اپنی طرف سے کوئی مسئلہ نکتہ یا ملفوظ عطا کیا ہو۔یا بحث مباحثہ کے نتیجہ میں ایک مسلسل مجلس اور ملفوظات کی مربوط زنجیر پائی جاتی ہو۔سوالات کا مربوط ہونا یا متحدالمقاصد ہونا ضروری نہیں۔بسا اوقات مختلف سوالات ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں رکھتے۔

مولانا حسین احمد مدنی (۱۲۹۶-۱۳۷۷ھ / ۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) کے ملفوظات کو جمع کرنے میں صرف نظر اس پر رہی کہ ان کو مختلف عنادین۔رموز تصوف، مسائل علمیہ معارف وحقائق، پند وموعظت، اصلاح معاشرہ، سیاسیات اور بکھرے موتی۔کے تحت جمع کر دیا گیا مگر مجلس کی فضا اور ملفوظات کا سیاق سباق غائب کر دیا گیا۔وہ صرف نمبروار ملفوظات شیخ الاسلام ہیں یہ طریقہ بعض دوسرے اکابر کے ملفوظات کی تدوین میں بھی اپنایا گیا ہے۔

مجالسِ صاحبِ ملفوظات کی نوعیت

ملفوظات کی مجالس کی نوعیت خالصتاً جامع یا جامعین کے نقطۂ نظر، طریقۂ کار اور حاضری کی مدت سے متعین ہوتی ہے۔یہ ایسا اصول ہے جو ہر قسم کے ملفوظات کی مجالس پر صادق آتا

ہے۔ یعنی خواہ مجالس صوفیہ کرام ہوں یا علمائے عظام یا دوسرے اصحاب علم وفضل کی مجالس ایک مجلس بنیادی طور پر جامع ملفوظات کی حاضری اور موجودگی کی مدت تک خاص ہوتی ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مجلس شیخ / حضرت اسی حاضری پر ختم ہوگئی اور جامع حاضر کی روانگی کے ساتھ اختتام پذیر ہوگئی۔ بلکہ تاریخی پس منظر، سوانحی واقعات اور دوسرے ذرائع سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صاحب ملفوظات کی مجالس جامع کی حاضری اور موجودگی سے قبل بھی آراستہ رہی تھیں اور اس کے بعد بھی جاری ساری اور آراستہ رہیں۔ بہرحال ان کی جامع سے قبل و بعد آراستگی کا امکان تو پایا ہی جاتا ہے۔

اسی سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ملفوظات تعداد کے لحاظ سے بس اتنے ہی نہیں ہوتے تھے جتنے جامع کے قلم یا ذہن کی گرفت میں آگئے بلکہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی اس کا ایک ثبوت ملفوظات کے جامعین کی کثرت میں ملتا ہے کہ وہ مجالس حضرت میں مختلف اوقات میں حاضر رہتے تھے۔ اور ان کی حاضری و موجودگی کی مدت کے مختلف ہونے کے سبب ملفوظات بھی متنوع، کثیر اور مختلف جمع ہو جاتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور دوسرے خواجگانِ چشت وصوفیان سلاسل کے ملفوظات کے مختلف مجموعوں سے اس کی تصدیق مزید ہوتی ہے۔ دورِ جدید میں حضرت حکیم الامت علامہ اقبال کے ملفوظات کے مختلف مجموعوں کا حال ہے کہ وہ مجالس کے تسلسل اور ملفوظات کے اختلاف وتنوع کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ایک مجلس کے ملفوظات میں اختلاف بیان و مواد در آنے کی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ایک جامع نے اپنی موجودگی میں جو سنا محفوظ کر لیا اور دوسرے نے اپنی موجودگی کے دوران ارشادات مدون کر دیئے۔ مجلس ایک رہی مگر ملفوظات میں تنوع پیدا ہوگیا۔ کبھی کبھار فہم وادراک بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے کہ کسی نے ایک بات کو کس طرح سنا اور دوسرے نے کس طرح۔ بہرحال ملفوظات کا تنوع، کثرت یا قلت، موضوعاتی نوعیت جامع حاضر کی موجودگی، غیر حاضری اور فہم وادراک کی بوقلمونی ملفوظات کے الفاظ وکلمات اور اسالیب کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسالیب ملفوظات

صاحب ملفوظات کی تعلیم و ترتیب، ذوق و مزاج، اور دوسری ذہنی اور قلبی واردات و اکتسابات کے علاوہ رنگِ مجلس سامعین کی بساطِ سماعت، حاضرین کی طاقت تحمل، حالات و واقعات کی فضا اور عمومی علمی، دینی، ادبی اور تہذیبی صورت حال ملفوظات کا اسلوب طے کرتی ہے۔ پھر حقیقت یہ ہے لب چکیدہ ارشادات کی تدوین و ترتیب کو مرتب و جامع کی ذہنی علمی اور تہذیبی ساخت متعین کرتی ہے اور آخر میں طریقۂ تدوین اسلوب کا رنگ روپ بناتا سنوارتا یا بگاڑتا اور مسخ کرتا ہے۔ انھیں اسباب و عوامل سے اور انھیں جیسے بعض دوسرے عناصر کی بدولت ملفوظات کے اسالیب ہوتے ہیں، ان میں گوناگونی، بوقلمونی اور ست رنگی ہوتی ہے۔

یک جملہ و یک نکتہ اسلوب

جن ملفوظات کو لطائف و ظرائف یا حکیمانہ نکات و دقائق اور متصوفانہ و فلسفیانہ حقائق یا ادبی تہذیبی نکتہ آفرینی کے اعتبار سے جمع کیا جاتا ہے وہ بالعموم ایک جملہ یا ایک نکتہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی گہری فکر، عمیق حکمت، یا ظرافت چھپی ہوتی ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا ایک ملفوظ ہے: "مردانِ خدا خود را پوشیدہ داشتہ اند و حق تعالیٰ ایشان را ظاہر گردانیدہ است" (ص ۲)

(ترجمہ: مردان خدا خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ ان کو ظاہر فرما دیتا ہے....)

ان میں کا اور ایک ملفوظ ہے: "ترک دنیا آن نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوتہ بہ بندد بنشیند۔ ترک دنیا آنست کہ لباس بپوشد و طعام بخورد۔

(ترجمہ: ترک دنیا یہ نہیں کہ کوئی خود کو برہنہ کرلے مثلاً لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ رہے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے ــــ و اما آنچہ می رسد روان می دارد و جمع نکند

دنیا او میل نہ کند و خاطر را بچیزی متعلق ندارد۔ (ص ۱۳-۱۲)۔ ایک اور اسی قسم کا ملفوظ ہے: لیکن اسے جو کچھ ملے اسے گردش میں رکھے اور جمع نہ کرے اور اس کی محبت نہ رکھے اور دل کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھے"صحبت را اثری تولیست" (ص ۱، صحبت کا بڑا قوی اثر ہوتا ہے)

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا ایک ملفوظ ہے: .... راحت در خانۂ فقر است، اما در خانۂ دنیا ہیچ راحت بنا شد، بجز غم و اندوہ ترجمہ: راحت تو خانۂ فقر میں ہے۔ لیکن دنیاوی گھر میں کوئی راحت نہیں۔ اس میں صرف غم و اندہ ہے۔ غم و اندوہ تو خانۂ فقر میں بھی ہے لیکن وہ دنیا کا غم و اندوہ نہیں۔ وہ حق طلبی کا غم و اندوہ ہے۔) (خیر المجالس ص۳۱)

مولانا حسام الدین کو شیخ چراغ دہلی نے خلافت عطا فرمائی تو عرض کیا: مارا وصیت چیست؟ خدمت شیخ فرمود: "ترک دنیا" (ترجمہ: ہمیں کیا وصیت فرماتے ہیں؟ حضرت شیخ نے فرمایا، ترک دنیا (کی نصیحت کرتا ہوں)" (خیر المجالس ص۴۷)

حضرت حکیم الامت اقبال علیہ الرحمہ کے تمام ملفوظات "روز گار فقیر" اسی نوع کے ہیں اور جواہر ریزوں کے ملفوظات کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے لیکن آواز سے محروم کر دیا" ص۶۷ روز گار) "مسدس حالی کو بھی شکوہ ہی کہنا چاہیے لیکن وہ صرف "شکوۂ ہند" تھا (ص۶) دیدار نبوی کے بارے میں ایک ملفوظ ہے: "پہلے اسوۂ حسنہ پر عمل کو اپنا شعار بناؤ اور زندگی میں اس کو ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو! یہی ان کا دیدار ہے" (ص۶) مد... اپنے تہذیب کو کس بہانے سے باپ کے یہ معلوم کیا ہے کہ وہ برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اگر آپ کے پاس تہذیب کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ دور حاضر میں تہذیب رو بہ تنزل ہے" (روز گار ص۶۸)۔ تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی بند ہوتی ہیں۔ اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتی ہیں، تو دنیا کی کھل جاتی ہیں اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے"۔ (روز گار ص۶۵) جس طرح دنیا کی دوسری اشیاء میں نر اور مادہ کا جنسی امتیاز موجود ہے اسی طرح قومیں بھی نر اور مادہ ہوتی ہیں۔ اور اس کا پتہ ان کے قول و عمل، معاشرت و کردار، خصائل اور نفسیات سے چلتا

ہے۔" (روزگار ص۸۲) ... "آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس مذہب کی خوبیاں چالیس سال کی عمر کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ تمہارا کام تو زمین ہموار کرنا اور اس میں پودا لگانا ہے۔ یہ پودا ایک دن خود بخود تناور درخت بن جائے گا اور پھل لائے گا۔" روزگار ص۸۵)۔

مولانا تھانوی کے ہاں بھی اسی قسم کے یک نکتہ و یک لفظ ملفوظات کی محفل آراستہ ملتی ہے:

"نسبت مع اللہ کی علت کسب نہیں ہوتی، محض فضل ہے لیکن کسب شرط ہے جیسے کہ وضو کہ شرط نماز ہے مگر اس کی علت نہیں" (حسن العزیز ص۱۵) "اختلاط سے سینکڑوں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بلا ضرورت ہرگز تعلقات نہ بڑھائے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ (حسن العزیز اول ص۲۱) عورت اگر مہر معاف کر دے لیکن پھر بھی ادا کرے کیونکہ یہ غیرت کی بات ہے کہ بلا ضرورت عورت کا احسان لے (اول ص۲۰۳)

مولانا مودودی کی عصری مجالس میں جدید مسائل اور علمی امور زیادہ زیر بحث آتے تھے۔

ان کے ملفوظات کم از کم اس ضمن میں اسی اسلوب کے نمایندہ ہیں۔

قرآن کریم سے فال نکالنے کے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا: "قرآن ہدایت کیلئے بھیجا گیا ہے اس سے ہدایت حاصل کیجیے۔ غیب کا علم خدا نے اپنے لیے رکھا ہے آپ غیب داں بننے کی کوشش نہ کیجیے" (ص۳۴) "اہل حق کی کامیابی یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں (ص۳۹)" انسان کی روحانی ترقی کیلئے جس چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے وہ خدا کے آخری نبی نے بتا دی ہے۔ اس کے بعد ہم روح کی غذا کے لیے ادھر ادھر کیوں بھٹکتے پھریں۔" (ص۴۵)۔ "مولانا آزاد ایک شریف النفس اور وسیع الظرف انسان تھے۔ وہ ان حضرات میں سے تھے جو گالیاں سنتے تو ہیں لیکن کبھی کوئی ان کی زبان سے کسی کے لیے گالی نہیں سنتا" (ص۴۶)

مولانا مدنی کے بعض ملفوظات مفرد ہیں: "عبادت پر اعتماد اور گھمنڈ کرنا خطرناک ہے" (اول ص۱) "ذکر پر مداومت کیجیے لذت مطلوب اصل نہیں ہے (اول ص۱۱) حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کا ایک ارشاد ہے: "کل ایک بچے نے دل خوش کر دیا۔ اس سے پوچھا: میاں کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ: عمر ضائع کر رہا ہوں" یہ احساس اور اعتراف بڑی چیز ہے۔" (ص۱۹۳) مولانا محمد الیاس کا ایک ملفوظ ہے: "جو انعامات اور ثمرات خون سے وابستہ تھے ان کیلئے کم از کم پسینہ تو گرانا چاہیئے۔ (ص۱۴۵)

ملفوظات مبنی بر دلائل

یک جملہ/نکتہ ملفوظات کے بالمقابل یا متوازی ملفوظات کی ایک قسم یا اس کے اسلوب کا ایک رنگ وہاں جلوہ گر ہوتا ہے جہاں اپنی بات کو صاحبِ ملفوظات دلائل سے مدلل کرتا اور براہین سے آراستہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملفوظات کئی کئی جملوں پر مبنی ہوتے ہیں ان میں توجیہہ و تعلیل کا انداز پایا جاتا ہے کہ وجوہ و اسباب کی کارفرمائی کے نتیجہ میں نتائج و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس اسلوب میں حکایات و قصص کا استعمال ہوتا ہے کہ سلفِ کرام کی سنت و اسوہ کی تائید کا پشتہ قول و ملفوظ میں لگے، قرآن و حدیث یا قول و اثرِ سلف سے استفاد کیا جاتا ہے کہ بات کی تقویت و توثیق فراہم ہو۔ منطقی استدلال، ایجابی سوال اور الزامی استفہام بھی حسبِ موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے ملفوظات ایک مختصر تقریر، خطبہ یا پیراگراف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نوع کے ملفوظات یک طرفہ بھی ہوتے ہیں کہ صاحبِ ملفوظات کی زبانِ حقیقت بیان سے پھول کی طرح از خود جھڑتے ہیں یا سامعین و حاضرین کے اشتراک سوال و جواب بحث و مباحثہ، تکرار و مناظرہ سے بھی وجود میں آتے ہیں۔ چند مثالوں سے اسلوبِ مدلل کا رنگ چوکھا نظر آئے گا:

شیخ نظام الدین اولیاء: "تائب یا متقی برابر است۔ زیرا کہ متقی آنست کہ مثلاً در ہمہ عمر خویش شرب نکردہ باشد یا معصیتی بوجود نیاوردہ۔ و تائب آنست کہ گناہ کردہ باشد و انابت آوردہ ... ہر دو برابر باشند بحکم ایں حدیث کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ (ص۲)۔" ہر چہ نفل می گزارند بجائے نمازہائے فریضہ کہ قضا شدہ محسوب می افتد۔ بعد ازاں حکایت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمود کہ او نمازہائے قضائے خود را ہر نمازی را پنج بار بگزاردی (ص۹۶)۔ حضرت شیخ کے طویل یا زیادہ بڑے ملفوظات کا نقل کرنا طوالت کلام کا باعث ہے۔ وہ فوائد الفواد میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ م ۱۳۵۶ء) کا ایک ارشاد ہے: "اللہ تبارک و تعالیٰ

کسی کو میلانِ دل اور توجہ خاطر پر عتاب کرتے ہیں کہ غیر کی طرف کیوں دیکھا۔ اور کسی کو طلب دنیا میں رکھتے ہیں اور دنیا کو آراستہ و مزین کرکے اس کے لیے بر و لاتے ہیں کہ رغبت کرے اور مشغول رہے" (مجلس ۵۹)

ان کا ایک اصل فارسی زبان میں منقول ملفوظ ہے: ..."سخن در تقویٰ بر گرفت، این آیہ فرمودند: ... یاایہاالذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ... بعد از نزول این آیہ صحابہ غمگین شدند کہ حق تقویٰ ہیچ کس نیست، تا آنکہ این آیہ منزل شد: فاتقوا اللہ ما استطعتم .... (خیر المجالس ۷۶)

علامہ اقبال کا ایک مدلل ملفوظ ہے: "اس معاملہ میں قابل غور امر یہ ہے کہ قرآن پاک عین فطرت ہے۔ لہٰذا فطرۃ اللہ کا انکشاف جس پر انسان کو پیدا کیا گیا، قرآن ہی کے ذریعے ہوا۔ پھر یہ فطرت اس نظامِ حیات ہی میں مشہود ہوئی جس کو اس نے دین کہا۔ اور دین کا تقاضا ہے وہ اعمال و عقائد جو ہر پہلو سے زندگی کو سہارا دیے رہے ہیں اور جن کو اصطلاحاً شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کہیں گے قرآن پاک میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔ گو انسان کو تصورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی قانون کی ... (اقبال کے تصور ومابعد ۵۵-۵۴)۔ حضرت علامہ کا یہ ملفوظ خاصا طویل ہے جو اسی نکتہ پر مبنی ہونے کے باوجود استدلال کی راہ سے دوسرے متعلقہ نکات بھی اس میں مدغم کرتا جاتا ہے اور دوسرے نوع کے ملفوظات سے اسے جوڑتا جاتا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور ارشاد اقبال ہے: "اب زمانہ قرآن مجید کے مطالعہ کا ہے مسلمانوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو خود ہی سمجھ لیں گے کہ ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے اور ان میں اپنی زندگی میں کس نہج پر قدم اٹھانا چاہیے ... قوموں میں تبدیلیاں دفعتاً نہیں، بلکہ چپ چاپ اور بتدریج رونما ہوا کرتی ہیں۔ یہ ایک عمل ہے جو آپ ہی آپ شروع ہوتا ہے اور آپ ہی آپ جاری رہتا ہے۔" (اقبال کے تصور اول ص ۱۲۴)

مولانا مدنی کا ارشاد ہے: "سب سے بڑا عمل تسخیر تقویٰ ہے۔ انّ الذین آمنوا

عملوا الصّٰلحٰت سیجعل لہم الرحمٰن ودا (اول ص۱۳۱)

دوسرا ملفوظ ہے: "بہت سے قریب رہنے والے ناکام رہتے ہیں اور دور کے بسنے والے مثل اویس قرنیؓ کامیاب ہو جاتے ہیں (ص۱۳۳)۔ تیسرا قول مدلل ہے: "جوانمردی اور اتباع خدا ورسول کی یہی شان ہے کہ انسان اپنے عزائم کو خواہشات کو اللہ ورسول کے سامنے سربسجود کر دے۔ اور خواہ کتنی ہی نفس پر مشقت اور ناگواری پیش آوے اس کی پروانہ کرے اور اللہ ورسول کا تابعدار رہنا ہے۔ لایکون احدکم مومنًا حتی یکون ھولہٗ تبعا لما جئت بہ یہ قول سرور کائنات علیہ السلام کا ہے"۔ اول ص۱۳۴)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ "اہل ذوق کو کلام اللہ اور حدیث شریف میں صاف فرق محسوس ہوتا ہے۔ اللہ کے کلام میں ایک خاص شوکت اور صولت ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس کا یہ کلام ہے وہ کسی سے دبتا یا ڈرتا نہیں ہے جس وقت جو بات چاہی کہہ ڈالی، برخلاف اس کے حدیث شریف میں بشری عجز کی شان بھی پائی جاتی ہے" (حسن العزیز اول ص۶۲)

مولانا مودودی کا ایک ملفوظ مدلل ہے: "... جو شخص اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے اس کی مغفرت ہوتی ہے اور اسے اجر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قرب کا درجہ عطا فرماتا ہے۔ مگر بعض چیزیں مثلاً قرض معاف نہیں ہوتا۔ غازی کو اجر عظیم ملتا ہے مگر یہ کوئی گارنٹی نہیں کہ اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ معاف کرنا اللہ کے سوا کسی کا کام نہیں۔ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء اس امید پر گناہ نہیں کرنا چاہیئے کہ فلاں خدمت انجام دینے سے یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور نہ مایوس ہونا چاہیے کہ خواہ کیسا ہی نیک کام کیوں نہ کریں گناہ معاف نہیں ہو سکیں گے۔ مومن کو (اول ص۱۴) بین الخوف والرجاء ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیئے اور اس سے امیدیں بھی رکھنی چاہئیں"۔ (۵-اے ذیلدار پارک دوم ص۴۲)

مولانا محمد الیاس کا ایک بہت اہم ارشاد ہے: "ہمارے اس کام میں اخلاص اور صدق دلی کے ساتھ اجتماعیت اور شوریٰ بینہم" کی (یعنی مل جل کر اور باہمی مشورہ سے کام کرنے کی) بڑی ضرورت ہے اور اس کے بغیر بڑا خطرہ ہے"۔ (ص۱۳۸)

ملفوظات بشکل خطبات

صوفیائے کرام، علمائے عظام اور دوسرے اصحابِ علم وفضل گرامی کے بہت سے ملفوظات چھوٹے چھوٹے تذکیری خطبوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان میں فرق بس یہی ہے کہ وہ منبر سے عطا نہیں کیے جاتے بلکہ مجالس ذکر وفکر میں سامعین وحاضرین سے کلام وگفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانی کے جو ملفوظات الفتح الربانی وغیرہ کے نام سے مرتب کیے گئے ہیں ان کی نوعیت خطبات کی سی ہے۔ امیر خسرو دہلوی اور امیر حسن سنجری نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے مجلسی ملفوظات کو خطبات کی ہی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح شیخ نصیرالدین چراغ دہلی اور دوسرے صوفیائے کرام کا معاملہ ہے۔ دورِ جدید میں صوفی علماء جیسے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی، مولانا شاہ مسیح اللہ خاں، مولانا محمد الیاس دہلوی اور متعدد دوسرے صاحبانِ ملفوظات کے مجموعوں میں ایسے خطبات نما ملفوظات کی کمی نہیں۔ مولانا مودودی جیسے خالص عالم ومفکر اور حکیم الامت اقبال جیسے فلسفی اور صاحب فضل کے ہاں بھی ایسے ملفوظاتِ تقریر نما کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

یہ خطبات نما ملفوظات کا اسلوب ایک تقریر کا سا ہوتا ہے جس میں متعدد مسائل وامور پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ان میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن میں مختلف ومتعدد نکات، امور، حقائق اور دقائق آتے چلے جاتے ہیں جن کو صرف سلسلۂ کلام ایک ادنیٰ تعلق سے مربوط کر دیتا ہے۔ جیسے افضل الفوائد میں مجلس ۲ کہ اس میں رویت الٰہی، امام اعظم کی بزرگی، امام شافعی کی بزرگی، خشیتِ باری تعالیٰ، حکایاتِ قاضی ابو یوسف وامام شیبانی فضیلتِ علم، بیانِ مجتہدین اور بیان مبتدعین کو ایک ہی مجلس کے خطبات/ملفوظات میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری نوعیت ان ملفوظات کی ہوتی ہے جو ایک ہی بنیادی نکتہ پر تقریر کی شکل میں متعدد جہات وبیانات رکھتے ہیں۔ صوفیا کے یہاں بھی ان کی مثالیں بہت ہیں اور دوسرے اہل علم کے یہاں بھی۔ مثلاً مولانا تھانوی نے ایک بار ایک تقریر کی صورت میں واضح کیا کہ نئے بیعت کرنے والے مریدوں کے سامنے وہ اپنا پورا معمول جاری رکھتے ہیں، جلدی بیعت نہیں کرتے، ان کو دیکھنے بھالنے اور پرکھنے کا موقع دیتے ہیں اور اسی سلسلہ میں وہ دوسرے بزرگوں کے طریقۂ بیعت کو بھی بیان کرتے ہیں (اول ص ۱۴۳-۱۴۴)

(مابعد)

ملفوظات میں علمی نکتہ آفرینی

تقریباً تمام صاحبانِ ملفوظات کے ہاں ایک سلسلہ نکتہ آفرینی کا ملتا ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا فن خوب جانتے ہیں اور اس کو سامعین و حاضرین کی اصلاحِ خیال و فلاحِ خاطر کے لیے خوب خوب استعمال کرتے ہیں۔ یہ نکتہ آفرینی صوفیا کے ہاں تصوف اور طریقت اور اہل طریقت سے زیادہ تر متعلق ہوتی ہے اور علماء و اہل علم میں قرآن و حدیث، کتاب و علم اور دوسرے علمی موضوعات سے حضرت نظام الدین اولیاء سے امیر خسرو نے سورۂ اخلاص کی طرح پورے قرآن مجید کی تسہیل کی درخواست کا واقعہ نقل کیا ہے کہ تکرارِ علم سے سب کچھ نرم ہو جاتا ہے (ص ۱۲۲) مولانا محمد الیاس کا ایک ملفوظ نکتہ آفریں ہے: "تم نے ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون کے مقتضاء سے جس قدر انحراف کیا اسی قدر خلقنا لکم ما فی السموات والارض کا ظہور کم ہو گیا ہے" ص ۱۴۳ مولانا تھانوی کے ہاں ایسی بہت سی نکتہ آفرینیاں موجود ہیں جیسے لا تاخذ بلحیتی سے داڑھی رکھنے کا وجوب ثابت کرنا (ص ۱۱۵)۔ علم و فضل سے متعلق ایسی نکتہ آفرینیاں حضرت علامہ اقبال اور مولانا مودودی اور دوسرے صاحبانِ علم کے ہاں خوب خوب ملتی ہیں۔ سرسید کی تاریخ وفات نکالنے کے لیے کہا گیا تو استاذ اقبال مولانا سید میر حسن نے نکالی غفرلہ (۱۳۱۵ھ) جبکہ شاگرد رشید نے قرآن سے ہی دوسری نکالی: انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک (۱۳۱۵ھ) (روزگار اول ص ۱۲۷)

ادبی نکتہ آفرینی

صاحبانِ ملفوظات چونکہ صاحبانِ علم و فضل ہوتے ہیں اس لیے ان کے ہاں نکتہ آفرینی کی ادبی نوعیت بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال سے ایک بار دو قالب ایک جان کہا گیا تو انہوں نے فرمایا: "ایک قالب دو جان کہا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا" (ص ۱۶۴) مولانا تھانوی نے موجودہ دور

کی قومی ہمدردی کو "ہمہ دردی" کہا تھا۔ (اول ص۵۱)، "دسترخوان پر دقیق دقیق باتیں نہیں کرنی چاہئیں بلکہ بہت معمولی معمولی باتیں ہونی چاہئیں (ص۷۱) مولانا مودودی سے سوال کیا گیا تاش کھیلنا حرام ہے؟ فرمایا: کم از کم حلال بھی نہیں۔" (اول ص۳۶) حضرت اقبال نے ایک بار کیا خوب سجع بیان کی: "دارد امید شفاعت ز محمدؐ اقبال" (روزگار ص۱۱۴)۔ حضرت علامہ کا مشہور نکتہ آفریں فرمودہ ہے کہ اقبال دیر سے ہی آتا ہے۔ ٹیگور سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے ایک بار انگریزی میں فرمایا: "Tagore preaches rest, practices action. Iqbal practices rest preaches action" (روزگار اول ص۱۴۸)۔ مولانا تھانوی نے ایک بار فرمایا تھا: "میں پستان تو نہیں چھوڑوا تا لیکن سپستان چھوڑوا تا ہوں یعنی سگ پستان (لسوڑے کے دانے) (اول ص۹)

مکالمات در ملفوظات

ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ سوال و جواب یا مکالموں کی صورتوں میں بعض ملفوظات پائے جاتے ہیں۔ اور ان کا حسن، تاثیر اور دردبست کی گرمی مکالمہ نویسی کی بنا پر ہی پائی جاتی ہے۔ اگر اس کو ایک بیانیہ کی شکل دے دی جائے تو ان کی اثر آفرینی اور ادبیت میں فرق آجائے گا۔ صوفیا اور علماء اور دوسرے صاحبانِ ملفوظات کے ہاں ایسے مکالمات عام طور سے ملتے ہیں۔ اوپر حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کا ایک ملفوظ ایک بچے کا مکالمہ کی صورت میں گذر چکا ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے ایک سکھ گیانی کے مسلمان ہونے کی خواہش اور ساتھ ہی مالی امداد چاہنے کی شرط پر ایک دیہاتی بزرگ کا قصہ سنایا: ایک جنگلی خرگوش کو کتوں نے دوڑایا تو اس نے ایک چارپائی کے نیچے پناہ لی جس پر چند آدمی بیٹھے تھے۔ بزرگ نے خرگوش سے کہا: "اے عقلمند پناہ لی بھی تو انسان کی" (روزگار اول ص۱۲۰)۔ حضرت عمر کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظ میں بھی اسی طرح کا مکالمہ موجود ہے۔ (ص۱۲۹)۔ حضرت تھانوی کے ملفوظات میں بھی بہت سے مکالمات ملتے ہیں جیسے حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا گنگوہی کا مکالمہ در باب گریہ (اول ص۲۱۲)۔

تشبیہات و تلمیحات:

ملفوظاتِ شیوخ وعلماء میں کثرت سے تلمیحات ہوتی ہیں اور تشبیہات بھی۔ وہ دونوں مفہوم سمجھانے میں کافی معاون ہوتی ہیں۔ مثلاً مولانا مدنی کا ایک ملفوظ گذر چکا ہے جو قریب کی محرومی اور دور کی سعادت سرفرازی سے متعلق ہے اور موخر الذکر کے لیے حضرت اویس قرنی کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ اس بات میں حضرت اقبال کی ایک تلمیح بہت عمدہ بلکہ چوٹی کی ہے۔ اخبار وطن کے مدیر نے حضرت علامہ کے محلے سے کشمیری طوائفوں کے اٹھوانے اور مدیر اخبار کے محلے میں بسانے کے پس منظر میں حضرت علامہ سے کہا: جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوادی گئی ہیں آپ کا دل یہاں نہیں لگتا۔ حضرت علامہ کا جواب تھا مولوی صاحب آخر وہ بھی تو وطن کی "بہنیں" ہیں"۔ اس مقولہ/نکتہ کا لطف اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ حضرت علامہ بھی کشمیری تھے اور مدیر اخبار بھی اور طوائفیں بھی۔ (ص ۶۴) حضرت علامہ نے اشعار کے کثرت سے نزول کو مچھلیاں پکڑنے اور چھوڑنے سے تشبیہ دی ہے (ص ۲۲) مولانا تھانوی نے ایک مجلس میں فرمایا: "ایک شیخ بہت کم گو تھے حضرت حاجی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں لوگوں کو فیض سے محروم کرتے ہیں خبر لی ہے کہ شیخ زبان ہوتا ہے اور مرید کان..." (اول ص ۱۱۸)۔ حضرت چراغ دہلی کا قول ہے کہ میں اپنی بیوی کی شکایتِ فاقہ کو "مثل ہوا کے جانتا ہوں کہ ایک کان میں آئی دوسرے کان سے نکل گئی۔ (اردو ترجمہ ص ۹۴)۔ مولانا علی میاں نے شاہ مجددی کے ملفوظ میں ایک تشبیہ نقل کی ہے "یہی وقت مغز کی بات کا ہے۔ جب ظاہری قویٰ ضعیف ہوجائیں تو اصل خالص بات نکلتی ہے۔ جب بادام کا خول توڑا جاتا ہے اور اس کی گری نکلتی ہے تو پھر روغن بادام حاصل کیا جاتا ہے (ص ۱۳۲)۔

اشعار کا استعمال

تقریباً تمام صاحبانِ ذوق اہل علم کے ملفوظات میں مناسب مقامات و مواقع پر اشعار کا استعمال ملتا ہے کہ شعر مفہوم نثر کو پورے طور سے واضح و روشن کر دیتا ہے۔ فارسی اور اردو کے اشعار زیادہ ہوتے ہیں اور کہیں کہیں عربی کے بھی مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا عجمی صاحبان ملفوظات کے ہاں ہوتا ہے جب کہ عربی ملفوظات میں صرف عربی کے اشعار ہی بار بار پا سکتے ہیں۔ بہت سے صاحبانِ ملفوظات

میں شعر گوئی کا ملکہ تھا لہٰذا وہ اپنے اشعار بھی کبھی کبھی پڑھ دیتے تھے علامہ اقبال تو خالص و اصل شاعر ہی تھے لہٰذا ان کے ہاں ان کا ہونا فطری اور معمولی بات ہے لیکن غیر معمولی بات ہے کہ اکثر وہ اپنے اشعار پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ اشعار کے استعمال میں دو طریقے بالعموم ملتے ہیں: ایک یہ کہ شعر سے مفہوم و نکتہ آفرینی اور ملفوظ کی عبارت نبائی۔ دوسرے یہ کہ موقع محل کی بات۔ بے موزوں و مناسب شعر خوانی کی بات سامع کے قلب و جگر میں سما جائے۔ بعض بزرگوں کے ہاں کچھ ملفوظات ایسے بھی ملتے ہیں جن کا آغاز کسی شاعر کے کلام و ذکر سے ہوتا ہے۔ مولانا تھانوی کے ہاں مولوی مثنوی/مولانا روم کا ذکر اور ان کے اشعار بہت کثرت سے ملتے ہیں بہ نسبت دوسرے صاحبانِ ملفوظات کے۔

مولانا تھانوی کا ایک ارشاد ہے: "صحبت کے متعلق یہ قطعہ مجھے بہت پسند ہے اس کو پڑھا کرتا ہوں:

گلے خوشبوئے در حمام روزے رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دلاویز تو مستم (اول ص۱۴۲)

حضرت تھانوی کو مثنوی روم سے جو دلچسپی تھی اس کے حوالوں سے ان کے ملفوظات بھرے پڑے ہیں (اول ص۱۴۲، ص۶۶، ص۹۰-۸۹، ص۹۳، ص۱۰۵-۱۰۶ وما بعد) مولانا مرحوم کی شعر خوانی کی روایت در اصل اکابر صوفیاء کی وراثت ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں ملتا ہے کہ ایک بار انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا:

درکوئے خرابات وسرائے او باش منعے نہ بود بیا و بنشیں و بباش (آئینہ ص۱۰۱)

اسرار الاولیا، ملفوظات بابا فرید گنج شکر (جامع بدر الدین اسحاق) میں بھی مولانا روم کے ایک نہیں کئی شعروں کا بیان کرنا منقول ہے (آئینہ ص۱۴۲)۔ حضرت بابا فرید کے ملفوظات کا ایک مجموعہ حضرت نظام الدین اولیاء نے راحت القلوب کے نام سے مرتب کیا تھا۔ وہ بھی اسی روایت کا پیرو نظر آتا ہے (آئینہ ص۱۵۵) اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین (مرتبہ بابا فرید گنج شکر) کا اس باب میں اسلوب وہی ہے (ص۹۸، ص۱۱۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چشتی صوفیائے کرام میں بالخصوص اور دوسرے اہل طریقت میں بالعموم مولانا روم اور ان کی مثنوی کو کتاب ہدایت کی حیثیت حاصل تھی۔ یہی تاثر علامہ

اقبال کے ملفوظات کے مطالعہ سے بھی ابھرتا ہے کہ علامہ موصوف کے معنوی پیر "مولوی معنوی" ہی تھے۔ مولانا مدنی کے ملفوظات میں بعض عربی کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ (اول ص۴۹، ص۱۱۸) اور فارسی اردو کے اشعار بھی (ص۱۱۹ ص۱۳۹) ، روم ص۱۶۳ وغیرہ) علامہ اقبال نے مومن کا مشہور شعر "تم مرے پاس ہوتے ہو گویا" کو ان کا واحد پسندیدہ شعر قرار دیا تھا (ملفوظات ص۱۴۷)۔

طنز و مزاح / شفتگی مزاج

بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اہل اللہ اور علما، دین وغیرہ مذہبی طبقات خوش مزاجی اور شفتگی سے دور ہوتے ہیں اور ان کے ملفوظات ان سے عاری۔ دراصل یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کچھ تو اس میں تقدیس کا ہالہ بننے کے سبب غلط فہمی کا دخل ہوا ہے اور کچھ بے علمی کے سبب حضرات صوفیہ اور دوسرے بزرگانِ دین و ملت بشری خصوصیات کے حامل بھی تھے اور قوم و معاشرہ کے مصلح بھی۔ وہ ان آلاتِ پند و نصیحت سے کیسے اپنے آپ کو تہی دست اور اپنے ملفوظات کو خالی رکھ سکتے تھے لہٰذا ان کے ملفوظات میں موقع و محل کے لحاظ سے بہت سے شگفتہ جملے بھی مل جاتے ہیں اور طنز و مزاح کے نمونے بھی۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے مرید امیر خسرو سے لطیف گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ فوائد الفواد میں بھی ایسے بعض لطیف جملے مل جاتے ہیں۔ بی بی فاطمہ نامی ایک صوفی خاتون کے بارے میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا جملہ نقل کیا گیا ہے: "آن زن مردے است کہ او را در صورتِ زنان فرستادہ اند"۔ (فوائد الفواد مجلس ۲۰)۔ تلاش و جستجو سے ایسے بہت سے بزرگوں کے ملفوظات میں مل سکتے ہیں۔

جدید دور میں مولانا تھانوی کے ملفوظات میں ایسے شگفتہ جملے زیادہ ملتے ہیں: ایک نوجوان باپ بننے والا لڑکا چھوٹا سا لگتا تھا اس لیے بعض مستورات اس سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ مولانا نے فرمایا: "نہیں اس سے بھی پردہ کرنا چاہیے۔ اور جب وہ چھوٹا سا (یعنی بچہ) آجاوے گا تب معلوم ہوگا کہ کیسا چھوٹا سا ہے؟" (اول ص۱۴۱) "آج کل لوگ شمس العلماء کو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ سچ مچ شمس العلماء

ہیں حالانکہ یہ محض حکام کی قدردانی ہے۔ باقی اس خطاب سے کیا کوئی لیاقت ثابت ہو گئی" (ص ۹۸)
"ایک شخص نے کسی امر سے اپنی خلاصی کی دعا بذریعہ خط نہایت تفصیل کے ساتھ کرائی کہ یہ صورت ہو جائے اور پھر وہ صورت ہو جائے۔ فرمایا کہ بھلے مانس نے اللہ میاں کو رائے دی ہے... (ص ۹۹) ... مزاح میں حضرت نے فرمایا کہ بھائی میری ناک میں درد تمہارے سر میں درد۔ درد والا درد والے کا کیا علاج کرے...؟ (حصہ دوم ص ۱۷)۔ ایک صاحب نے وصیت کی کہ میرا وقت آخر ہو تو مولانا کو ضرور بلوا بھیجو۔ حضرت سے کہا گیا تو "ہنس کر فرمایا کہ کہیں میری صورت کو سورۂ یٰسین نہ سمجھنے لگیں جو مرنے کے وقت پڑھی جاتی ہے..." (حصہ دوم ص ۵۹ وغیرہ) مولانا تھانوی کے ملفوظات کے اس پہلو پر پورا ایک دفتر تیار کیا جا سکتا ہے۔

مولانا مدنی کے ہاں مولانا مودودی کے بارے میں بعض بہت سخت طنزیہ بلکہ استہزائیہ ملفوظات ملتے ہیں۔

علامہ اقبال کے ملفوظات میں طنز و ظرافت میں بھی شرافت خیال و لفظ کا عنصر بہت نمایاں ہے: "نظریہ ارتقاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: "پسندیدہ ہے مگر اسے اصلیت نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اونٹ کی گردن اس لیے لمبی ہو گئی کہ اسے اپنی خوراک شاخوں پر تلاش کرنی پڑی" (ملفوظاتِ اقبال ص ۱۳۹)۔ "انتظار مہدی کے سلسلہ میں ایک ملفوظ ہے: "اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں مگر وہ آنے میں نہیں آتا... میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام مہدی کے لیے نہیں اٹھا رکھنے چاہئیں" (ایضاً ص ۱۴۲) "ہندوستان میں قوم ہے کہاں جس کے لیے قومی ترانہ لکھا جائے" (ایضاً ص ۱۴۷)۔ ہندو شاعری اور ادب کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "... ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالیے کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک صرف ایک استثنا ہے: رامائن، اور وہ بھی بعض حصوں میں" (ملفوظات ص ۱۵۶) علامہ اقبال عجمی اقوام بالخصوص ہندوستانی قوم کی نفسیات کو "طبعی نسائیت" سے تعبیر کرتے تھے (ص ۱۵۶)۔ حمید احمد خاں کے اس مضمون میں علامہ مرحوم کی اسلامی فنِ تعمیر پر پوری گفتگو کو اس بات میں رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً الحمراء کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں الحمراء میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی دیوار پر "ہو الغالب" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے، کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔" (ص ۱۵۸) ۔ جیمز جینز (Jeans) کے اس نظریہ پر کہ "قادر مطلق" ایک بڑا ریاضی داں ہے" علامہ اقبال کا تبصرہ ہے: "اس طرح آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا "شاعر مطلق ہے"۔ اور یہ دنیا جو اس کی تخلیق ہے ایک ایسی نظم ہے جس کا مطلع اور مقطع ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے"۔ (ص ۱۶۳)

ملفوظات کی صحت :

مؤرخین اور تصوف کے حامی اہل قلم کے درمیان اس موضوع پر بحث تو چلی آئی ہے کہ بہت سی کتب ملفوظات کی صحت و معتبریت کیا اور کیسی ہے اول الذکر بہت سی کتابوں کو جعلی قرار دیتے ہیں جبکہ ان کے صحیح ہونے پر موخر الذکر کو اصرار ہے۔ ہمیں سر دست اس سے بحث نہیں ہے مولانا اخلاق حسین قاسمی نے پروفیسر محمد حبیب کے خیالات پر بحث کی ہے اس لیے ان دونوں کے مضامین کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے (آئینہ ملفوظات ص ۲۲-۱) ہمارا دارو مدار بحث صحیح و معتبر ملفوظات کے اسالیب پر ہے البتہ صحت و عدم صحت کے ایک پہلو سے ضرور ہمیں سروکار ہے۔ اور وہ یہ کہ ملفوظات کی تدوین کی ذمہ داری جامع کی ہوتی تھی لہٰذا ان کے مندرجات کی صحت و عدم صحت کے لیے بھی وہی ذمہ دار ہوتا تھا جس طرح وہ زبان و بیان اور اسلوب و پیشکش کے لیے ہوتا تھا۔ لیکن اگرچہ ملفوظات صاحبِ ملفوظات کی خدمت میں قرارت و سماعت کے ذریعہ پیش کر کے ان کی تصدیق و تائید کرا لیتا تھا جیسا کہ فوائد الفواد کے سلسلہ میں معلوم ہوتا ہے تو مندرجات و مضامین کی ذمہ داری میں صاحب ملفوظات بھی شریک ہو جاتے تھے لیکن زبان و بیان اور اسلوب بہر حال جامع و مدون ہی کا رہتا تھا۔ اس میں یہ امکان بھی ہے کہ جامع نے صاحب ملفوظات کے اصل الفاظ و بیانات کو محفوظ و منتقل کرنے کی کوشش کی ہو اور ایسے ملفوظات میں اسلوب شیخِ مجلس کا بھی بن جاتا ہے۔

خاتمۂ بحث

ملفوظات کے اسلوب یا اسالیب کا موضوع بہت وسیع ہے اور بسیط بھی۔ ایک مقالہ میں اس کا کامل احاطہ نہیں کیا جاسکتا بہر حال گذشتہ اوراق میں اس کا ایک جائزہ بعض شواہد و حقائق اور اقتباسات کی بنیاد پر پیش کیا گیا۔ خاتمۂ بحث میں بعض اہم اصولی چیزوں کو از سرِ نو ملاحظہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کچھ اہم نکات مزید اجاگر ہوں گے۔

سب سے اہم اور اول بات یہ ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں ملفوظات کی کوئی نوع نہیں ملتی اور مؤرخین نے اس پر بحث ہی نہیں کی ہے۔ اور اگر کسی نے اس موضوع پر کچھ کہا ہے تو بہت سرسری ہے۔ لیکن ان کے عدم التفات، اجتناب یا گریز سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عربی ادب میں ملفوظات کا وجود نہیں تھا۔ بہر حال یہ تو طے شدہ اور مسلمہ امر ہے کہ کلاسیکی دور میں بالخصوص خلافت اسلامی کی اولین صدیوں میں بزرگانِ دین و ملت کے مجالس میں ارشادات و ملفوظات وجود میں آتے تھے اور بعض بعض کے جمع بھی کیے گئے لیکن ان کو بالعموم "کلام" یا "اقوال" یا "لفظ" سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ حضرات خلفاء، علماء، قضاۃ اور دوسرے اہلِ علم و فضل کے کلام و اقوال یا الفاظ ان کی سیرتوں میں یا دوسری کتب میں ملتے ہیں۔ ان کا بالعموم جو اسلوب ملتا ہے وہ حکیمانہ یک نکتہ / یک لفظ اسلوب ہے۔ لیکن ایک دو جملوں میں کوئی حکیمانہ بات کہی جاتی ہے۔ ان کو "جوامع الکلم" کے حدیثی اصطلاح کے مطابق جامع اقوال / ملفوظات کہا جاسکتا ہے۔ اس کا بہر حال امکان ہے کہ "نبوی جوامع الکلم" کا انداز و اسلوب ان کی پیدائش و وجود کا باعث بنا ہو۔

ادب کی اس قسم و نوع اور شاخ کا باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت سے آغاز و ارتقاء بہر حال صوفیائے کرام کے ملفوظات سے ہوا ہے اور اسی بنا پر ملفوظات کو صرف تصوف سے ہی وابستہ و محدود سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل تصوف کے دوش بدوش اہل علم کے دوسرے طبقات نے بھی اپنے اپنے دائرے میں ملفوظات کی تدوین کا کام کیا ہے لیکن وہ کافی کم ہے۔ ہر لحاظ سے۔ لہٰذا اسلوب / اسالیب کے جائزہ کا آغاز ملفوظاتِ تصوف سے ہی کرنا پڑتا

ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں چشتی ملفوظات کی ایک مسلسل اور مستحکم روایت ڈالی گئی جو ساتویں/تیرھویں صدی سے شروع ہوئی اور دورِ جدید تک وسیع ہے۔ وہ دورِ متوسط میں فارسی میں زیادہ تر ہے اور دورِ جدید میں اردو میں۔ لہٰذا ان ملفوظات کے اسالیب بھی تصوف کے اسالیب ہیں۔ دورِ جدید میں دوسرے اہلِ علم و فضل کے ملفوظات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی لہٰذا ان کے موضوعات و مضامین میں تنوع کے ساتھ ساتھ ان کے اسالیب میں بھی تنوع و گوناگونی آئی۔

صوفی مصادر اور دوسرے مآخذ سے بھی یہ امر سامنے آتا ہے کہ ملفوظات میں خواہ وہ کسی کے ہوں الحاق کا عنصر ہوتا ہے اور روایت بالمعنی کا تو بہرحال ہوتا ہی ہے۔ لہٰذا اس نکتہ پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ خیر المجالس میں ایسا ہی ایک بیان موجود ہے۔ اقبال کے حضور کے بارے میں مشفق خواجہ کا تبصرہ ہے کہ اس میں حضور زیادہ ہے اور اقبال کم۔

ملفوظات کے وسیع ادب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے ہی اسالیب کا اختلاف و تنوع اجاگر ہوتا ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ وہ تقریباً تمام انواعِ ملفوظات میں مشترکہ طور سے پایا جاتا ہے سوائے چند ایک اسالیب کے۔ مثلاً ہمہ جہت قسم کے صاحبانِ ملفوظات کے ہاں ایک مجلسی فضا ملتی ہے جس میں ایک مسلسل بحث مباحثہ کا رشتہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا جڑتا جاتا ہے۔ یہ مباحثہ و مذاکرہ کا اسلوب ہے۔ جو بالعموم صوفیا، یا علما، کے ہاں مفقود نظر آتا ہے کہ جامع یا تدوین کرنے والے ملفوظات کی فضا بنانے سے قاصر رہتے ہیں۔ صوفیہ کی مجالس ہوں یا علماء کی ان میں مجلس فضا تو ہوتی تھی مگر مدون کرنے والے نے ان کے ملفوظات کو ایک رشتۂ تسلسل میں نہیں پرو دیا۔

"جوامع الکلم" کا اسلوب تمام ملفوظات میں ملتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں حکیمانہ بات، فلسفیانہ نکتہ آفرینی یا ادبی نکتہ سنجی کہی جاتی ہے جو دل و دماغ دونوں کو بیک وقت مسحور و متاثر کرتی ہے کہ یہی صاحب ملفوظات کا مقصود و منتہا ہوتا ہے۔ ان کو یک نکتہ یا یک لفظہ ملفوظ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو آفاقی مقولے یا کثرت سے نقل کیے جانے

والے اقتباسات (quotable quotes) کی صنف میں آتے ہیں۔ ان کا اسلوب خود مختار جملوں کا سا ہوتا ہے کہ کہیں بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

ایک دوسرا اسلوب یہ ملتا ہے کہ نکتہ یا موضوع و مواد تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کے اظہار و ابلاغ کے لیے کئی جملے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بالعموم یہ مدلل ملفوظات ہوتے ہیں کہ ان میں عقلی دلائل ہوتے ہیں، منطقی استنباط ہوتا ہے، توجیہہ و تعلیل ہوتی ہے، کتاب و سنت یا طرقِ سلف سے استناد ہوتا ہے۔ دو چار جملوں سے زیادہ ایک پورے پیرے/اقتباس کی نوعیت بھی ان کی ہو سکتی ہے۔

دینی، صوفی اور علمی ملفوظات میں بالعموم کتاب و سنت اور اقوال صحابہ و تابعین اور آثار سلف کرام سے استناد کرنا ایک اہم اسلوب و انداز بیان ہے۔ ان کے ذریعہ صاحبانِ ملفوظات اپنے بیانات، اقوال، کلمات اور اشادات کو سندِ اعتبار عطا کرتے ہیں اور سامعین و حاضرین کے دل و دماغ میں ان کی قبولیت کی راہ کو مزید ہموار کرتے ہیں۔

سندِ اعتبار اور استنادِ معتبریت فراہم کرنے کی خاطر صوفیائے کرام بالعموم اپنے بزرگ اکابر و شیوخ کے حکایات و قصص بھی کسی ایک یا متعدد نکات کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے ملفوظات میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر ایک نکتہ کے بعد ایک یا اس سے زیادہ حکایات ہوتی ہیں جو ان کے ملفوظات کو اعتبار و استناد کا پشتہ لگا دیتی ہیں۔ علماء و فضلاء اور دوسرے اہل علم کے ملفوظات میں شیوخ صوفیہ کے علاوہ تاریخی واقعات سیرتی حقائق اور واقعاتی شواہد کا پشتہ لگا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اپنے طبقہ کے سلف سے سندِ اعتبار لاتے ہیں۔

تمام ملفوظات میں خواہ صوفیانہ ہوں یا عالمانہ، حکیمانہ ہوں یا فلسفیانہ، دانشورانہ ہوں یا بقول حسرت موہانی عارفانہ ایک اہم اسلوب یہ نظر آتا ہے کہ صاحبانِ ملفوظات از خود یا سوال و التماس کی تحریک پر ایک مختصر تقریر فرماتے ہیں۔ یہ خطبات نما ملفوظات ہیں۔ ان کی مثالیں مواعظ کی مجالس کے بیانات و خطبات کی مانند ہوتی ہیں۔ یہ خطبہ نما ملفوظات ایک نکتہ کے گرد بھی گھومتے ہیں اور کبھی ان کا محور کئی نکات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں

اندرونی تسلسل ہوتا ہے اور جذب دروں کی طرح موضوعاتی، نفسیاتی اور اسلوبیاتی ارتباط بھی ہوتا ہے۔

ظاہری دوائرِ ملفوظات کے علاوہ تقریباً تمام ملفوظات میں کچھ مشترکہ اقدار اسلوب ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے سوال جواب، استفتاء و فتویٰ اور استفسار و التماس کا انداز۔ سامعین و حاضرین کا سوالات کا جواب صاحبان ملفوظات کی جناب سے عطا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نکاعات کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ صاحبانِ ملفوظات اپنے ملفوظات و ارشادات میں بھی از خود مکالمات کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں بالخصوص جب وہ حکایات و قصص یا تاریخی واقعات بیان کرتے ہیں۔ نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی بھی ملفوظات کی ایک اور اسلوبیاتی مشترکہ قدر ہے۔ وہ ادبی بھی ہوتی ہے اور علمی اور صوفیانہ بھی اور حکیمانہ بھی۔ صاحبان ملفوظات دوسرے انواعِ بیان و بلاغت میں تشبیہات و تلمیحات کا استعمال زیادہ کرتے ہیں کہ ان سے اظہار و ابلاغ کی قوت اور ترسیل کی تاثیر میں بہت اضافہ ہوتا ہے اور اس کی نسبت سے ان کے خانہ دل میں جاگزیں ہونے کا امکان بھی انھیں مقاصد سے صاحبان ملفوظات اشعار کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں اور طنز و ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں۔ شگفتگی، برجستگی اور خوش مزاجی کی ایک زیریں لہر جن ملفوظات میں ہوتی ہے وہ سامعین و حاضرین کیلئے جنت نگاہ اور فردوس گوش بن جاتی ہے اور گوش و دماغ سے گذر کر سیدھے دل و جگر تک جا پہنچتی ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ صاحبان ملفوظات صاحبان فکر و نظر اور نباض نفسیات ہوتے تھے۔ وہ حکیم و دانشمند ہوتے ہیں جو افراد و طبقات کی طبیعت و مزاج کے رمز شناس ہوتے ہیں لہٰذا وہ موقع و محل کی مناسبت سے اور حاضرین و سامعین کی رعایت سے مختلف اسالیب بیان اختیار کرتے تھے۔ جب یہ سارے اسالیب سمٹ جاتے ہیں تو ملفوظات کا خاص اسلوب وجود میں آتا ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

اس مقالہ کی تیاری میں حسب ذیل مراجع و مصادر سے مدد لی گئی ہے

امیر خسرو دہلوی — افضل الفوائد، اردو ترجمہ، سجاد پبلشرز لاہور ۱۹۶۰ء۔

امیر حسن علاء سنجری، — فوائد الفواد، مقدمہ و تصحیح محمد لطیف ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز لاہور ۱۳۸۶ھ ۱۹۶۶ء۔

سید علاء الدین بن علی حسینی، الدر المنظوم ترجمہ ملفوظ المخدوم، مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ

حمید قلندر، — خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، اردو ترجمہ مولانا احمد علی نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۸ء

حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری، — مجالس الحکمۃ، مکتبہ تالیفات اشرفیہ، تھانہ بھون غیر مورخہ۔

عزیز الحسن مجذوب، — ملفوظات حسن العزیز، 〃 〃 〃 تین جلدیں۔

عبد الماجد دریا آبادی، — حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء۔

ابو الحسن بارہ بنکوی، — ملفوظات شیخ الاسلام، مکتبہ علم و ادب دیوبند ۱۹۶۴ء، دو جلدیں،

مظفر بیگ / رفیع الدین ہاشمی حفیظ الرحمن احسن، — ۵-اے ذیلدار پارک، مکتبہ ذکریٰ رامپور ۱۹۸۰ء اول دوم سوم

میر نذر علی درد کاکوروی، — ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلوی، سلمان اکیڈمی کراچی ۱۹۶۱ء اردو ترجمہ فخر الطالبین و مناقب فخریہ از سید نور الدین حسین۔

ابو الحسن علی ندوی، — صحبتے با اہل دل، کتب الفرقان لکھنؤ ۱۹۷۷ء

تنویر احمد علوی، — صحیفۂ ابرار ترجمہ خیر البیان و ملفوظات رزاقیہ ادارہ مطبوعات نور محمد جھنجھانہ مظفر نگر ۹۴-۱۳۹۳ھ ۷۴-۱۹۷۳ء۔

حکیم حفیظ اللہ لار، — ملفوظات اولیاء، دار الاشاعت اسلامیہ کلکتہ غیر مورخہ

محمد منظور نعمانی، — ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس، کتب خانہ الفرقان لکھنؤ ۱۹۶۹ء

اخلاق حسین قاسمی، — آئینہ ملفوظات، کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۸۳ء

(نوٹ) ملفوظات اقبال کے تمام مصادر و مراجع بھی ملاحظہ ہوں جو خاکسار کے مقالہ ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت کی کتابات میں شامل ہیں۔

مولانا محمد رضوان القاسمی

ملفوظات و مواعظ ادب کے آئینہ میں

اپنے دل کی بات کو سلیقہ، قرینہ، گھلاوٹ، گداز اور شرافت کے ساتھ مؤثر طور پر پیش کرنے کا نام "ادب" ہے ادب کے ذریعہ دل کا درد اور خوشی کے جذبات اس طرح دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں کہ پہونچانے والے کی خواہش ہوتی ہے کہ قارئین اور سامعین بھی اس کے احساس میں شریک ہو جائیں، کارڈنیل نیومین نے ایک جگہ ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا مؤثر اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعہ ادب کہلاتا ہے" ایک اور ادیب نے لکھا ہے کہ "ادب سے مراد یہ ہے کہ بات کو ایسے لطیف اور حسین انداز میں پیش کیا جائے کہ سننے والا کوئی بوجھ یا تنگی محسوس کیے بغیر اس کا اثر قبول کرلے"۔

ادب اپنے اس مزاج و مذاق کے اعتبار سے ہر زبان اور زبان کے ہر دور اور عہد میں موجود رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ زبان و بیان کی اس قوت کا استعمال کس غرض اور کس مقصد کے لئے کیا گیا ہے؟ اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں اکثر اس قوت کا استعمال خاندانی برتری اور نسبی و نسلی فخر و مباہات کے لئے کیا جاتا تھا۔ اس کے ذریعہ انتقام کے شعلے بھڑکائے جاتے تھے اور ان شعلوں کو سرد ہونے سے بچایا جاتا تھا، نیز کبھی اس کا استعمال سفلی جذبات اور ہیجان انگیز صنفی احساسات کے اظہار کے لئے ہوا کرتا تھا۔

جدید دور میں جو ادب ابھر رہا ہے اس کی عمومی غرض و غایت بھی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں " دو کف جو" کا حصول ہی معلوم ہوتا ہے، یا پھر انسان کے حیوانی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے، افسوس کہ یہ نظم و نثر دونوں پر یہی تصور چھاتا چلا جا رہا ہے، یہاں خوشی

اور غم، طرب اور کرب کا اظہار بھی ایک مصنوعی اور غیر حقیقی عمل بن کر رہ گیا ہے۔ بقول شاعر

یوں تو الفاظ ہیں اظہار مطالب کے لئے
لوگ الفاظ میں نیت کو چھپا دیتے ہیں۔

دین اسلام اس بارے میں ہماری دو طرفہ رہنمائی کرتا ہے وہ ہم کو زبان کا فطری اسلوب اور اظہار کا غیر مصنوعی اور حقیقی طریقہ بھی بتاتا ہے، جو بہ تکلف قافیہ بندی اور بے معنی الفاظ کی بہتات سے خالی ہے اور اس امر پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زبان کی طاقت اور اس کی اثر انگیزی کو کن مقاصد اور اغراض کے لئے استعمال کیا جائے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زبان صالح سماج کے فروغ کا ذریعہ ہے، وہ گرانقدر اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے کا ہتھیار ہے، وہ امن و آشتی، احترام انسانیت اور معرفت خداوندی کا مدرسہ ہے وہ انتقام کی آگ کو بجھانے اور محبت و اخوت کی آنچ کو گرم کرنے کا سامان ہے وہ انسان کے سفلی حیوانی جذبات کے بجائے اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار کا سرچشمہ ہے۔ اور ان کو فروغ دینا چاہتا ہے ادب اگر ان تصورات سے ہٹ جائے تو وہ انسانی سماج کے لئے زہر ہے اور اگر وہ ان اغراض کو سامنے رکھ کر اپنا سفر طے کرتا ہے تو وہ انسانیت کے لیے تریاق ہے، مشہور مصنف اور ادیب نعیم صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جس کے اوراق کا مطالعہ کر کے جب ہم فارغ ہوں تو محسوس کریں کہ ہم نے فکر و کردار کی راہوں پر ترقی کا کوئی نہ کوئی قدم بڑھا لیا ہے، کسی افسانے یا نظم اور کسی اداریے اور تنقید نے ہمیں ہمارے حیوانی رجحانات اپنی نفسیاتی الجھنوں، معاشرے کی بے انصافیوں اور بین الاقوامی تشدد و جارحیت کے خلاف نئی قوت سے مسلح کر دیا ہے۔"

بامقصد اور بے مقصد ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نامور ادیب نے یہ اہم بات لکھی ہے کہ "انسانی زندگی بے مقصد نہیں ہے اور ادب اس مقصد زندگی کو واضح تر کرنے کا نام ہے لیکن بے مقصد ادب نے بازاروں میں کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں، یہ ڈھیر انسانوں کے ذہنوں پر بوجھ ان کے قیمتی اوقات کے دشمن اور ان کی اقتصادیات کے گہن ہیں۔"

اردو کے مشہور ادیب اور مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"نوع انسانی جس المناک اضطراب میں مبتلا ہے اور روز بروز مبتلا ہوتی چلی جا رہی ہے، اس کا اصل سبب اعتدال کی سیدھی راہ سے اس کا بھٹک جانا اور یہ سیدھی راہ اگرچہ نظروں کے سامنے موجود ہے لیکن جو لوگ بندگی نفس اور فریب نظر میں مبتلا ہیں، وہ اول تو اس کو دیکھنا نہیں چاہتے اور دیکھ بھی لیں تو اس پر آنا نہیں چاہتے۔ اس سیدھی راہ پر آنے کی بجائے وہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ خود ان کے لیے اور ساری دنیا کے لیے کرب والم میں روز افزوں اضافے کے سوا کچھ نہ ہو، اس حالت میں جن لوگوں کو سواء السبیل کی معرفت حاصل ہے، ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اٹھیں اور قوت کے ساتھ عالم انسانی کو اس کج روی سے روک کر سیدھی راہ پر چلائیں، اپنی ادیبانہ صلاحیت کو انسانیت کے بھٹکانے میں نہیں بلکہ راہ راست پر لانے میں استعمال کریں، کوئی شعر و ادب اپنے لفظی و معنوی خوبیوں کی بناء پر قابل قدر نہیں ہے، وہ اگر زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے کام نہیں کرتا ہے تو ذہن کی عیاشی اور ارباب نشاط کی عشوہ گری ہے، اور اگر زندگی کو بگاڑنے کے لیے کام کرتا ہے تو میٹھا زہر ہے، قدر کے قابل وہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا حسن زندگی کے جمال میں اضافے کا موجب ہو رہا ہو۔"

عربی کے بلند پایہ ادیب اور صاحب قلم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"ادب ادب ہے، خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے لیکن اب اس دور میں یہ شرط کر دی گئی کہ جب تک مذہبی صحیفوں پر بھی کوئی چھینٹ نہ ڈال دیتا ہو۔ اس وقت تک وہ ادب نہیں، میں صاف کہتا ہوں اور دبستان ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی، وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی، ادب تھا کہاں؟ لیکن جب خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے

اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں، پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقی اور فطری ادب بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو۔"

ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات اور میلانات اور عمل، طرز فکر اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے، اس لیے وہ مفید بھی ہوسکتا ہے اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی بھی، اس لیے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس کو تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور تخریب کے لئے بھی، اور ان دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آسکتے ہیں، وہ معاشروں کی تخلیق بھی کرسکتا ہے اور حکومتوں کی تعمیر اور تاسیس بھی، اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو صحیح رُخ پر لگایا جائے اور اس سے تخریب، انتشار خیال اور لذت اندوزی اور نفسی پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے اس کو خیر پسندی، صلاح و تقویٰ اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے۔

ادب کے اس اجمالی تعارف کے بعد دیگر زبانوں کے ادب پر تبصرہ کرنے کی بجائے موضوع کی مناسبت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صرف عربی اور اردو ادب کا مختصر تذکرہ کیا جائے، سب جانتے ہیں کہ عربی میں اسلامی ادب کا سب سے پہلا اور کامل نمونہ قرآن مجید ہے اس کا بالکل جداگانہ اور نرالا اسلوب ہے اگرچہ کہ یہ ایک کتاب ہے مگر اس میں خطابت کا حُسن بھی شامل ہے، ایک ایک مضمون سو سو رنگ سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اکتاہٹ کی بجائے دل نشینی پیدا ہوتی ہے پوری کتاب میں ایک جملہ اور ایک لفظ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے، اس کا ہر لفظ اور ہر محاورہ انقلابات زمانہ کے باوجود آج تک متروک نہیں ہوا، اس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب اور اس کی وضاحت آج بھی عربی کی اعلیٰ وضاحت مانی جاتی ہے، اس زبان میں پیغمبر اسلام اور صاحب قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان کے ارشادات جمع ہیں، جو اپنی تاثیر، دل آویزی

اور ادبی معیار میں اپنی مثال آپ ہیں، پھر اسلامی عہد کے سینکڑوں مصنفین اور اہل علم و قلم ہیں، جن کے ادبی شہ پارے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور آج بھی اس میں چوٹی کے لکھنے والے اسلامی ادیب موجود ہیں۔

جہاں تک تعلق اردو زبان کا ہے تو یہ صحیح ہے کہ یہ ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستانی اہل علم اور اہل ادب نے مذہبی حد بندیوں سے بالاتر ہوکر اس کے گیسو کو سنوارا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ زبان دراصل ان گودوں میں پروان چڑھی ہے جو دین اور دینی اقدار کے نمائندے تھے جن چار شخصیتوں کو اردو زبان کا عناصر اربعہ کہا جاتا ہے، یعنی مولانا حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اور مولانا شبلی نعمانی، یہ سب علماء تھے اور اسلام سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا۔ ہم اگر ذرا اور ماضی کی طرف جائیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اردو اسلامی ادب کا باضابطہ آغاز طوطی ہند امیر خسرو سے ہوتا ہے، جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ قدیم ہندی (اردو) زبان میں دوہے اور رباعیاں لکھیں، بات آگے بڑھتی ہے اور وہ زمانہ بھی آتا ہے کہ جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزندان شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم شائع کئے، ان کے بعد مختلف علماء اور اسلام پسند حضرات کے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں، اشعار اور حلقہ ہائے درس کے ذریعہ اردو میں اسلامی ادب کو فروغ و ترقی دیا ہے اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ نام قابل ذکر ہیں، خواجہ حسن نظامی، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا یوسف بنوری، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انوار اللہ خاں فاروقی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا قاری محمد طیب، مولانا محمد تقی امینی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، نواب بہادر یار جنگ، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید محمد میاں، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا مفتی عتیق الرحمان، عثمانی، حکیم سید عبدالحی حسنی (صاحب گل رعنا) مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالباری ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا افضل حسین، مولانا اصغر حسین، مولانا یعقوب الرحمان عثمانی، مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھی، مولانا محمد ثانی حسنی ندوی، مولانا اسحٰق جلیس ندوی، مولانا نور عظیم ندوی، اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، شورش کاشمیری، عروج احمد قادری، عامر عثمانی مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اور امجد حیدر آبادی اور دوسرے ان مرحومین کے علاوہ موجودہ لوگوں میں بھی اسلامی ادب سے وابستہ افراد کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر اس مختصر میں نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس موقع پر اس کا تذکرہ بے محل نہیں ہوگا کہ تنظیمی اور جماعتی حیثیت سے دار المصنفین اعظم گڑھ ندوۃ المصنفین دہلی، اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی، مکتبہ اسلامی دہلی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ امارت شرعیہ بہار، جمعیۃ علماء ہند دہلی، فرقانیہ اکیڈیمی بنگلور، دار الاشاعت دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد مرکز دعوت وتحقیق حیدر آباد، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڑھ اور ادارہ ادب اسلامی کے ذریعہ اردو میں (پاکستان کے علاوہ) اسلامی ادب کی جو خدمات انجام پا رہی ہیں، وہ کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے بہت وقیع ہیں اور یہ ایک واقعہ ہے کہ ان مذکورہ افراد اور اداروں کا ذکر کئے بغیر ہندوستان میں اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ ہندوستان کے ہر قابل ذکر بڑے شہر میں مختلف اشاعتی اداروں کے ذریعہ اسلام سے متعلق موضوعات پر ہر سال بے شمار کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ بھی ادب اسلامی ہی کا حصہ ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلامی تعمیری اور بامقصد ادب کا جو خوشگوار تسلسل علماء صوفیاء اور مصلحین کے ذریعہ چلا آرہا ہے، اسے ایک منظم شکل دی جائے اور ادب کے اس نقطۂ نظر کو اپنانے اور اس کی ترجمانی کرنے والوں کو آپس میں مربوط کیا جائے، اور ادب کی راہ سے جو برائیاں آرہی ہیں اور بسا اوقات اس کے ذریعہ دین ومذہب کو جو نشانہ بنایا جاتا ہے اس پر نظر رکھی جائے تاکہ صالح اور تعمیری ادب کو پروان چڑھنے اور اسے فروغ وترقی حاصل کرنے کا

خاطرخواہ موقع ملے۔ جس کا مجموعی اثر اچھا انسان اور اچھا شہری بننے اور بنانے کی شکل میں ظاہر ہو۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام ۱۹۸۴ء میں عمل میں آیا جس کے اصل محرک اور روح رواں عربی اور اردو کے نامور ادیب اور مختلف اصلاحی دعوت و تحریک کے بے غرض نقیب، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں، مولانا نے ایک مضمون ۱۹۵۷ء میں اس وقت لکھا تھا جب وہ باوقار علمی ادارہ "المجمع العلمی العربی، دمشق" کے رکن منتخب ہوئے تھے مولانا کا یہ مضمون "المجمع" کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا جس میں بطور خاص اس طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ ادب عربی میں اسلامی عناصر کو تلاش اور اجاگر کرنے کی موجودہ ادبی ماحول میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس ضرورت کے پیش نظر مولانا نے "مختارات" (عربی) کے نام سے ایک کتاب بھی تالیف فرمائی۔ مولانا کے اس مضمون اور اس کتاب سے متاثر ہو کر امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کے شعبۂ ادب کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا نے اس موضوع پر کام کرنا بھی شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں متعدد قیمتی تحریریں اور کتابیں سامنے آئیں۔ عرب ادبا میں بتدریج یہ جذبہ نشوونما پاتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر رافت الباشا نے ایک ملاقات میں منظم اور مربوط طریقہ پر اس کام کو آگے بڑھانے کی خواہش کی۔ چنانچہ ۱۷ تا ۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء میں اسی بنیاد اور فکر پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک اہم سمینار منعقد ہوا جس کا موضوع "عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش" تھا۔

ندوہ میں اس سمینار کے لیے مولانا علی میاں کی طرف سے جو دعوت نامہ جاری کیا گیا تھا وہ نہایت بصیرت افروز اور تاریخی تھا، مولانا نے اس موقع پر جو خطبہ صدارت پیش فرمایا تھا وہ بھی حد درجہ پر اثر اور عالمانہ تھا۔ اس سمینار میں اندرون ملک کی دینی و عصری جامعات کے فضلاء کے علاوہ کثیر تعداد میں تین درجن کے قریب علماء اور ادبا شریک ہوئے تھے، اور آٹھ مرکزی موضوعات کے تحت (۳۲) اہم عنوانات مقرر ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ ادب کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے (۲۴) اہم تجاویز منظور

کی گئیں تھیں جن میں ایک تجویز ادب اسلامی کے سکریٹریٹ کے قیام سے متعلق تھی چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مجلس ادبیات اسلامی کے نام سے اس مقصد کے لئے ایک مستقل سکریٹریٹ قائم کر دیا گیا۔

مجلس ادبیات اسلامی کے قیام اور کام کو چند سال گزرے تھے کہ ۱۹۸۴ء میں مولانا علی میاں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ اس موقع پر مکہ مکرمہ میں ۷ رمئی کو عربی ادب کے ممتاز فضلاء کا ایک وفد ڈاکٹر عبدالباسط بدر، استاذ حیدر غدیر اور ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح کی قیادت میں مولانا سے ملا۔ یہ وفد ریاض اور مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ ادب اسلامی ہی کے موضوع پر بطور خاص مولانا سے بات چیت کے لئے آیا تھا۔ اس وفد کے قائدین نے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد بیان کئے اور اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مولانا سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی خواہش کی۔ اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ عرب دانشوروں کی ایک کمیٹی بنا دی جائے اور مراکش اور جزائر سے لے کر خلیج کی ریاستوں کے ادباء اور اہل قلم کو شرکت و رکنیت کی دعوت دی جائے اور آئندہ سال اس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو۔ اس کا صدر دفتر ندوۃ العلماء ہی میں رہے گا اور ندوہ کے صدر شعبۂ ادب عربی مولانا رابع ندوی اس کے جنرل سکریٹری ہوں گے۔

چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۷، ۸، ۹ رجنوری ۱۹۸۶ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کی پہلی کانفرنس ہوئی جس میں رابطہ کے دستور اساسی کو آخری شکل دی گئی۔ تنظیمی انتخابات ہوئے اور مولانا علی میاں کو تاحیات اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تعلیمی اور تصنیفی اداروں کے فضلاء اور اہل قلم کے علاوہ بیشتر عرب ممالک کے علماء اور ادباء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا عالمی اجلاس استنبول (ترکی) میں ۲۱، ۲۲، ۲۳ رجون ۱۹۸۷ء کو ہوا۔ پھر ایک اور اجلاس استنبول ہی میں ۱۲ تا ۱۶ اگست ۱۹۸۹ء کو ہوا ہے، جس میں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک کے فضلاء شریک ہوئے اس اجلاس میں مشہور

مصنف اور اسلامی مفکر سید قطب شہید کے بھائی ممتاز صاحب قلم وادیب محمد قطب اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے بھی شرکت فرمائی۔ اس کے علاوہ عالمی رابطہ کی ہندوستانی شاخ نے ۱۷، ۱۸ر فروری ۱۹۸۷ء کو جے پور میں بعنوان "اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات" ۱۱، ۱۲ر نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں بعنوان "سید احمد شہید کی تحریک کے اثرات اردو زبان وادب پر"، ۷ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اورنگ آباد میں بعنوان "نعتیہ شاعری" تاریخی وعلمی جائزہ اور خصوصیات"، ۷ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو حیدرآباد میں "بعنوان "تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب کا حصہ"، ۷ر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو رائے بریلی میں بعنوان "حمد ومناجات" ۱۳ر تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بھوپال میں بعنوان "دعوتی واصلاحی ادب"، ۱۷، ۱۸ر نومبر ۱۹۹۲ء کو لکھنؤ میں بعنوان "خطوط اور تاثراتی خاکوں کا ادب" ۱۲ر تا ۱۳ر جنوری ۱۹۹۴ء کو بنگلہ دیش میں بعنوان "مشرقی اقوام کی زبان وادب میں اسلامی رجحانات" ۲۲، ۲۳ر اپریل ۱۹۹۴ء کو بنارس میں بعنوان "حدیث شریف کی ادبی وفنی خصوصیات" ۷ر تا ۹ر اپریل ۱۹۹۵ء کو اورنگ آباد میں بعنوان "ادب میں سفرناموں کی اہمیت" اور ۱۰ر تا ۱۲ر نومبر ۱۹۹۵ء کو اعظم گڑھ میں بعنوان "سوانحی ادب اور تذکرہ نویسی" عظیم الشان سمینار اور اجتماعات منعقد کئے اس طرح اب تک ۱۲ر سمینار ہو چکے ہیں،

مقام مسرت ہے کہ "ملفوظات ومواعظ۔ ادب کے آئینہ میں" جیسے اہم موضوع پر اب حیدرآباد میں رابطہ کا یہ تیرھواں سمینار یکم تا ۳ر نومبر ۱۹۹۶ء کو (بمقام دارالعلوم سبیل السلام، عقب صلالہ، بارکس) منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں شرکت کے لئے صدر رابطہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ بھی تشریف لا رہے ہیں، حیدرآباد ہمیشہ ہی سے اہل دل صوفیوں اور بزرگوں کا گہوارہ رہا ہے اس لحاظ سے اس موضوع اور مذاکرہ کے لیے حیدرآباد کا انتخاب معنی خیز ہے آخر میں اس کا ذکر بے جا نہیں ہوگا کہ حیدرآباد کا مقام علمی، ادبی، تہذیبی اور صحافتی اعتبار سے بڑا اونچا ہے۔ اس شہر نے ہمیشہ مشاہیر علم وفن کو اپنی آغوش محبت میں جگہ دی ہے خصوصیت کے ساتھ یہاں کی مملکت آصفیہ نے علماء، فضلاء، اسلامی ادب اور تعلیمی اداروں کی فیاضانہ سرپرستی کے ذریعہ ایک مثالی تاریخ بنائی ہے، یہاں کی یہی وہ جاذبیت اور کشش تھی کہ

ماضی میں سرسید احمد خاں، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا الیاس برنی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبداللہ العمادی، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری اور اس طرح کے بہت سارے اصحاب علم وفضل اس "بغداد علمی" میں کشاں کشاں آئے اور مناسب اور سازگار ماحول پاکر علم وتحقیق کے موتی بکھیرے، اسی طرح اس خطہ علمی سے تعلق رکھنے والے مولانا انوار اللہ خاں، مولانا عبداللہ شاہ صاحب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی افکار وادب کی اشاعت میں جو اہم حصہ ادا کیا ہے اسے یہاں کی تاریخ مرتب کرنے والا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس) کا تعلق بھی یہیں سے ہے جن کی حیثیت اس وقت علم وتحقیق اور اسلامی ادب کی دنیا میں بلاشبہ سنگ میل کی ہے، اردو شعراء کا جب تذکرہ آئے گا تو اس زبان کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی اور صوفی منش رباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی اور معرفت وحکمت سے لبریز کلام کے حامل حضرت شاہ خاموش اور حضرت صوفی غلام محمد کا تذکرہ ناگزیر ہوگا۔ اس کے ساتھ جامعہ عثمانیہ دارالترجمہ دائرۃ المعارف، کتب خانہ آصفیہ کتب خانہ سعیدیہ اور اس طرح کے بہت سارے تعلیمی تصنیفی اداروں اور متعدد اہم کتب خانوں نے یہاں کی بزم علمی کو آراستہ کرنے میں جو اہم رول ادا کیا ہے اسے قطعاً فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اردو کی عمومی خدمت کے اعتبار سے بھی حیدرآباد کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، یہاں اردو کی درجنوں انجمنیں ادارے اور کتب خانے قائم ہیں۔ اور خوشی کی بات ہے کہ ہر انجمن، ہر ادارہ اور ہر کتب خانہ میں زندگی کی حرارت پائی جاتی ہے۔ ایک بہت بڑی تعداد میں ادب کی ہر صنف سے متعلق ادیب اور شاعر موجود ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنھیں اپنے فن میں کمال کا درجہ حاصل ہے اور بعض ملکی، اور بعض بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، اس اعتبار سے بھی "گیسوئے اردو" کو سنوارنے میں حیدرآباد کو اونچا مقام حاصل ہے، ہر سال جو یہاں بعض "مشاعرے" ہوتے ہیں وہ بھی پورے ہندوستان کی ادبی دنیا میں غیر معمولی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں البتہ اردو کے ہر بڑے شہر کی طرح حیدرآباد بھی اب "اردو دانی" میں پستی کی طرف

جارہا ہے اور نئی نسل اردو لکھنے، پڑھنے، بولنے سے تیزی کے ساتھ محروم ہوتی جا رہی ہے اس میں "قصور" کس کا ہے؟ یہ ایک تجزیہ کا موضوع ہے تاہم ہم سب کو مل کر مختلف وجوہ سے اردو کو تقویت پہونچانا چاہیئے، اسلام پسندوں کو تو خصوصیت سے اردو کی ترویج واشاعت میں آگے آنا چاہیئے کہ یہ ایک اہم ملکی اور قومی زبان ہے اور اس کے ساتھ عربی زبان کے بعد اس زبان میں اسلام کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی اس دوہری حیثیت نے اردو کے سلسلہ میں اسلام کے علمبرداروں کی ذمہ داریوں کو دوچند کر دیا ہے،

اس پس منظر میں امید ہے کہ "رابطہ ادب اسلامی" کا حیدرآباد میں یہ علمی و ادبی سمینار ہر طرح کامیاب ہوگا۔ اور نئی نسل اور موجودہ لوگوں کے سامنے ادب اسلامی کا وہ حصہ واضح طور پر سامنے آئے گا جس کا تعلق ملفوظات ومواعظ سے ہے، اور اس کی روشنی میں رہروان علم وادب اور مشتاقان اصلاح وتزکیہ کو نیا حوصلہ، نیا اعتماد، نیا پیغام اور نیا عزم ملے گا۔

زیر نظر مضمون کو ختم کرتے ہوئے اس وقت بے اختیار مجھے "نقوش اقبال" کے مصنف جن کا شمار ادب شناسی اور ادب نوازی کے اعتبار سے گنے چنے لوگوں میں ہوتا ہے بلکہ اس مرحلہ سے گذر کر "صاحب طرز ادیب اور منفرد انشاء پرداز" کی صف میں شامل ہیں یاد آرہے ہیں میری مراد مخدوم اور محترم اور استاذ معنوی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم سے ہے ان کو بارہا میں نے اقبال کے درج ذیل اشعار لحن اور خاص کیف و سرور کے ساتھ خصوصی مجلس اور عمومی اجتماع میں پڑھتے ہوئے سنا ہے، اس وقت ان کے چہرے پر یقین کا نور بھی ہوتا ہے اور دل میں سرور عشق بھی، لیجئے۔ اقبال کے یہ اشعار مولانا کے ہم نوا بن کر آپ بھی خودی اور مستی کی کیفیت کے ساتھ پڑھئے، غور کریں گے

تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار میں ادب اسلامی کا جو معنوی اور باطنی پیغام ہے وہ اس طرح رچا بسا ہے جیسے پھول میں خوشبو رچی بسی ہوتی ہے ؎

اے اہل نظر! ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک یا دو نفس مثل شرر کیا

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

پروفیسر انیس چشتی

اقوال زرّیں

تاریخ وادب کے آئینے میں

قول زریں، مختصر ترین لیکن آبدار ترین عبارت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں پیغام عمل اور معانی کا ایک جہاں آباد ہوتا ہے۔ ان جملوں میں مبتدا اور خبر اتنے نوکدار ہوتے ہیں کہ اپنے اندر نشتر کی کاٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں "ہنوز دلّی دور است" جیسی سادگی پائی جاتی ہے لیکن ان کے معنی و مطالب ـــــ کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ قول زرّیں میں استعمال کیے جانے والے فعل کا کوئی زمانہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اکثر مضارع ہوتے ہیں۔ اقوالِ زرّیں کی سماعت سے وہ غیر مرئی لمحہ میسّر آتا ہے جسے "مسرّت" کہتے ہیں۔ یہ منطق اور لغت کے بکھیڑوں سے آزاد ہوتے ہیں گویا کوئی اچھوتا خیال بلا ارادہ ذہن میں ڈھل جائے اور زبان سے ٹپک پڑے۔ اقوال زریں کسی منصوبے کے تحت تحریر نہیں کیے جاتے بلکہ یہ پختہ کار ذہن کے چھتنار سے پکے پھل کی طرح ٹپک پڑتے ہیں۔ اور سینہ بہ سینہ ملّتوں اور قوموں تک ہوا اور پانی کی طرح پہونچتے رہتے ہیں۔ ان جملوں کا کوئی وطن اور ان کی کوئی قومیت (NATIONALITY) نہیں ہوتی۔ یہ بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے سرحدیں پھلانگتے ہیں کیونکہ ان پر بیک وقت ایک عامی سے لے کر ایک عالم تک کی اجارہ داری قائم رہتی ہے۔ اور صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی ان میں انشا و ادب کی سرداری کا دم خم باقی رہتا ہے۔ بلکہ جوں جوں دن بیتتے جائیں ان کی کج کلاہی پر خلوص کے Detergent کی چمک بڑھتی جاتی ہے۔ مختلف اجنبی زبانوں میں ڈھلنے اور ترجمہ کاری کے صدمات سہنے کے باوجود ان کے

مرکزی خیال کی پسلیاں ٹوٹنے نہیں پاتیں اور جوڑ چٹخنے نہیں پاتے اور نہ ہی ان کے اصل معنی کہناتے ہیں۔

اقوال زریں کسی ساز باز، تحریک یا ازم کا شاخسانہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے نتیجے میں نئی تحریکیں وجود میں آتی ہیں، زندگیاں پلٹا کھاتی ہیں اور قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ یہ جملے افراد و ملل کو نئے آفاق سے آگاہ کرتے ہیں اور انھیں خیابان خیابان اِرم کی سیر کراتے ہیں۔ ادبِ انسانی ایسے جملوں کی تاریخ سے بھرا پڑا ہے۔ بعض مرتبہ اقوال زریں کہلائے جانے کے مستحق کئی جملے معمولی افراد کی زبان سے بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ اور اندھیری رات میں شہاب ثاقب کی روشن لکیر کا مزہ دیتے ہوئے اندھیاروں میں اس لیے گم ہوجاتے ہیں کہ ان کا ادا کرنے والا فرد کوئی بڑا یا نام آور آدمی نہ تھا۔ قلم یا زبان کی نوک سے رطب و یابس ہونا آسان ہے۔ لیکن بغیر کسی پیشگی منصوبہ بندی کے قول زریں کا لفظی تاج محل بنانا آسان نہیں۔ قول زریں کا ہر ہر لفظ ناگزیر (Indispensible) ہوتا ہے۔ گویا اس میں لفظوں کے تلاطم کو صرف کوزے میں ہی نہیں بلکہ قطرے میں بند کرنا پڑتا ہے۔ خیال کو کاغذ پر منتقل کرنے کے بعد غالب کے لیے اپنے آدھے سے زیادہ دیوان کو جمنا برد کرنا آسان تھا لیکن کسی مخصوص ذہنی کیفیت کے وقت بے ساختگی سے ادا کیے جانے والے جملے کی تراش خراش کے لیے کاغذ اور قلم کوئی کہاں سے لائے اور بفرض محال کاغذ اور قلم آ بھی گئے تو جمنا کہاں سے لائیں۔ وہ تو دلّی سے بھی زیادہ دور رہے۔

دنیا کی کسی زبان کو اگر ہم ایک سلطنت گمان کریں تو اس کے صاحب اقتدار افراد اس کے اصول و قواعد ہوئے۔ کہاوتیں اور محاورے وزیر ہوئے۔ جبکہ اقوال زریں اس زبان کے سفیر، قاصد اور ایلچی ہوئے۔ کہاوتوں اور محاوروں کا خالق زمانہ اور سماج ہوتا ہے۔ آپ کسی محاورے کے ساتھ اس کے تخلیق کار یا مصنّف کا نام نہیں دیکھیں گے۔ البتّہ اقوال زریں کے ساتھ اس کے کہنے والے کا نام ضرور ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک زبان سے دوسری زبان میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نقل و

حرکت زبان، زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اقوال زرّیں کا ترجمہ ممکن ہے جبکہ بعض کہاوتیں اور محاورے ترجمے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اور وہ کسی دوسری زبان میں منتقل ہونے سے پہلے ہی انتقال فرما جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ زرّیں اقوال محاورے نہیں ہیں۔ یہ لطیفے اور حاضر جوابیاں بھی نہیں ہیں، یہ مواعظ بھی نہیں ہیں اور نہ ملفوظات۔ کئی زرّیں اقوال کو جوڑنے سے ایک وعظ نہیں بن سکتا۔ البتہ ایک وعظ میں کئی زریں اقوال پائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہر قول زرّیں کا کسی شخصیت کے ساتھ منسوب ہونا ضروری ہے۔ لیکن کوئی صاحب، کئی اقوال زریں گھڑ کر اگر اپنی شخصیت بنانا چاہیں تو یہ ممکن نہیں۔ اقوال زرّیں کے ساتھ منسوب فرد کی شخصیت کا منارہ قد ہونا ضروری ہے۔ اس میں تذکیر و تانیث کی درجہ بندی بھی ضروری نہیں۔ زرّیں اقوال ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد سے منقول ہیں۔ اس صف میں ہم صاحب حال اور صاحب قال سے لے کر تو اہل دل تک اور صاحب جلال اور صاحب جمال سے لے کر خواتین تک کو کھڑا پائیں گے۔

جس وقت جولیس سیزر (۱۰۰ تا ۴۴ ق م) نے کتب خانہ اسکندریہ کو آگ لگائی تھی تو کلوپیٹرا (۶۲ تا ۳۰ ق م) نے کہا تھا،

"وحشی کہیں کے، تم عالموں کو قتل کر دیتے ہو۔ ہم ان کی ممی بنا کر محفوظ رکھتے ہیں۔ تم کتابوں کو ردی سمجھ کر جلا دیتے ہو اور ہم ان علمی خزانوں کو نئی نسلوں تک پہنچا کر دوام بخشتے ہیں۔"

پتہ نہیں قلوپطرہ نے یہ جملہ کہنے کے لیے کس زبان کا استعمال کیا تھا۔ اور اس جمال جہاں آرا کا قد کتنا تھا۔ ہاں البتہ اس جملے نے ہماری نظر میں اس کا قد ضرور بلند کر دیا ہے۔ کیونکہ مستشرقین نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ رکھا تھا۔ ہم تک یہ مقولہ مختلف سرحدوں اور زبانوں سے ہوتا ہوا جارج برنارڈ شا کے ذریعے پہنچا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیت اللہ شریف کی حفاظت کے لیے جب اپنی بوڑھی والدہ حضرت اسماءؓ سے اجازت چاہی اور ازراہ شبہ سوال کیا کہ "اگر میں شہید ہو جاتا ہوں تو دشمن میری لاش کا مثلہ کریں گے"، تو حضرت اسماءؓ نے اپنے بیٹے کو ہمت دلاتے ہوئے نہایت

جرأت سے کہا کہ:۔

"جب بکری ذبح ہوجاتی ہے تو اسے اس بات کی کیا فکر کہ اس کی کھال کیسے اتاری جاتی ہے۔ اور اس کی ہڈیوں اور گوشت کو کیسے ٹکڑے کیا جاتا ہے۔"

ملکہ اودھ بیگم حضرت محل نے جو کہ معرکۂ لکھنؤ میں انگریزوں سے شکست کھا کر نیپال چلی گئی تھیں اور جب انھیں انگریزوں نے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی تو کہا تھا کہ:

"اگر میرا وصال ہوجائے تب بھی میری لاش کو یہیں (کٹھمنڈو میں) دفن کر دینا کیونکہ میں اپنے غلام وطن میں دفن ہونا نہیں چاہتی۔"

آج بھی اودھ کی سپاہیانہ مزاج رکھنے والی یہ خاتون کٹھمنڈو کے ایک عام قبرستان میں آسودۂ خاک ہے۔

مولانا محمد علی جوہر، جن کے پاس میکالے کی زبان، برکلے کا قلم اور نپولین کا دماغ تھا لندن میں اپنے انتقال سے قبل کہہ گئے کہ:

"میں اس وقت تک ہندوستان نہیں جاؤں گا جب تک کہ مجھے مکمل آزادی کا پروانہ نہیں مل جاتا۔"

اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آج بھی بیت المقدس کی سرزمین میں اپنے ہی شعر سے آراستہ نورِ مزار کے سائے میں آسودۂ خواب ہیں ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلائی بہار
مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

روایات اور اقوالِ زرّیں میں فرق ہے۔ روایات بنتے بنتے بنتی ہیں۔ البتہ قول زرّیں کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی بے ساختگی (SPONTINITY) ہے۔ حضرت قطب عالم برہان الدین عبداللہ ابن محمود (م ۸۵۰ھ) ایک بار تہجد کی نماز کو اٹھے کہ رات کے اندھیرے میں کسی لکڑی یا پتھر سے پاؤں ٹکرایا اور چوٹ آگئی۔ اس وقت آپ کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا:

"لوہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے۔"

یہ ہے تو ایک سادہ سا استفہامیہ جملہ، لیکن اُردو ادب کی تاریخ میں یہ جملہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ کیونکہ آج سے تقریباً ۶۰۰ سو سال پہلے گجرات کی سرزمین میں ادا کیا جانے والا اُردو زبان کا یہ اولین جملہ ہے۔ جسے حضرت قطب عالم کے مریدوں نے جوں کا توں محفوظ رکھا ہے۔ بادشاہوں کے فرامین اور اقوال میں تو روایت کی ہیرا پھیری اور ترجمے کی بد لباسی کا پایا جانا ممکن ہے۔ لیکن مذہبی اور روحانی پیشواؤں کے ملفوظات میں کسی قسم کا تصرّف عوام گناہ سمجھتے ہیں۔ دن کی روشنی میں جب اس صدمہ پہنچانے والی چیز کو دیکھا گیا تو اس میں حضرت کی فرمودہ تینوں اشیاء کی خصوصیات پائی گئیں۔ تحفیظ کا تقریباً یہی عمل حضرت نظام الدّین اولیاءؒ سے مروی "ہنوز دلّی دور است" کے ساتھ بھی ہوا۔ سلطان غیاث الدّین تغلق کا آپ کے ساتھ آویزش کا معاملہ مشہور ہے۔ جو دہلی کے قریب پہنچنے کے باوجود بھی حضرت سے نمٹنے کے لیے دہلی نہیں پہنچ سکا اور راستے ہی میں اس کا کام تمام ہو گیا۔

ماضی سے حال کی طرف عود کر آیئے اور اپنے ہی دور کی ایک مثال سنتے چلئے، جس کے جملہ کردار ابھی حیات ہیں، قضیہ بابری مسجد کے دوران جب ایک مؤقر وفد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں بھارت کے وزیر اعظم سے ملا تو مولانا کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا کہ:

"تاریخ کو الٹا سفر مت کروایئے۔ تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے۔ اس سے بچ کر نکل جانے میں ہی بھلائی ہے۔"

اسی طرح وی۔پی سنگھ بحیثیت وزیر اعظم ہند جب، مولانا کی زیارت کے لیے تشریف لائے تو انھوں نے کہا کہ آپ کی اکثر کتابیں میرے مطالعے میں رہتی ہیں۔ تحریک پیام انسانیت سے متعلق ایک کتابچے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اسے کئی بار پڑھ چکا ہوں اور اس کا یہ جملہ تو مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ:

"آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو وہ اپنے آپ کو کھانے لگتی ہے۔"

لکھنؤ میں رابطہ ادب اسلامی کا پہلا اجلاس تھا۔ افتتاحی خطبے کے دوران مولانا کے درج

ذیل جملے نے سب کو چونکا دیا جو آپ اس سے پہلے بھی کئی بار فرما چکے ہیں:

"آج کل ہر جگہ سائن بورڈ لگانے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔ ادب میں بھی مخصوص وردی پہننا اور سائن بورڈ لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ جب تک آپ یہ وردی نہ پہنیں اور سائن بورڈ نہ لگائیں آپ کو کوئی ادیب ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔"

اب رہی بات "روایات" کی تو اسے یوں سمجھ لیجئے کہ روایات ایک طویل سماجیاتی کیمیائی عمل (PROCESS) کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ دو چینی روایات کا آزاد ترجمہ سن لیں۔

"بیٹوا اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتا ہے۔"

دوسری ہے، "آپ کا سب سے بڑا دشمن وہ اجنبی ہے جو آپ کی زبان جانتا ہے۔"

ان روایات پر تبصرہ کرنے کے بجائے آپ کے تجربے سے فیض اٹھانا زیادہ موزوں ہوگا۔

دنیا کے سب سے زیادہ آبدار جملے فاتحین اور صاحب شمشیر و سنان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے اقبال نے کہا تھا ؎

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اسی تناظر میں آپ نپولین کا یہ جملہ دیکھیں کہ:

"ذہین دماغ سے ٹپکا ہوا وہ جملہ جس میں کوئی نیا تصور ہو۔۔ ۵۰ توپوں کے دہانوں کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے کافی ہے۔"

تو آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ قلم کی طاقت کو تلوار کے دھنی نے کس طرح تولا ہے۔

اک ذرا یہ بھی منظر دیکھئے:

ہندوستان میں اکبر کی حکمرانی کا دور دورہ ہے، نئی عمارتیں بن رہی ہیں اور شہر آباد ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی شہرت سات سمندر پار کر کے مغربی اقوام کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ آئے دن فرنگی تجار، مذہبی پیشوا، صنّاع اور سفارتی وفود جلال الدّین محمد اکبر کے دربار میں

وارد ہوتے ہیں۔ اور نئی نئی ڈفلی بجاتے اور اکبر کی فیاضیوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک سیّاح جب اکبر کے آباد کردہ تازہ ترین شہر فتح پور سیکری کی سیر کے بعد اکبر کے دربار میں لوٹا تو اکبر نے اس سے حسب معمول شہر کی آبادکاری سے متعلق تبصرہ سننا چاہا۔ مغربی سیّاح نے جی کھول کر تعریف کی لیکن اتنا ضرور کہا کہ "بادشاہ سلامت! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی آپ نے اس شہر کے اطراف کوئی شہر پناہ یا فصیل کیوں تعمیر نہیں کی۔ تاکہ دشمن کے حملوں سے اس خوبصورت شہر کی حفاظت ہو سکے"۔

اکبر نے سیّاح کے تبصرے کا جس سپہ سالارانہ انداز سے جواب دیا ہے۔ اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

اکبر نے کہا "اگر ہم اپنے دشمن کو کابل و قندھار کی سرحد پر روک نہیں سکے تو اس نوزائیدہ شہر کے اطراف کی دیواریں اس کے اقدام کو کیسے روک سکے گی"۔

اُندلس، ہسپانیہ، یا اسپین کی سرزمین پر اسلامی حکومت کا قیام اقوام و ملل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ ۹۲ء میں شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد کی قیادت میں بارہ ہزار مجاہدین اسلام کا ایک لشکر کشتیوں کے ذریعے بارہ میل چوڑی آبنائے کو عبور کر کے جب اندلس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دوسری جانب مقابلے کے لیے روڈرکس (RODRICKS) کا ایک لاکھ کا ٹڈی دل موجود ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر طارق نے تمام کشتیاں برباد کر دیں اور اپنی فوج کو خطاب کر کے ایک نہایت پر جوش تقریر کی جس میں اس نے کہا:

"العدو أمامکم والبحر وراءکم فاین المفر"

"مسلمانو! دشمن تمہارے آگے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے اب فرار کا موقع کہاں؟"

طارق کی یہ تقریر کافی طویل ہے۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں اسے پڑھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس تقریر کا وہ جملہ جو بیت الغزل کہلائے جانے کا مستحق ہے آپ کے سامنے اردو میں پیش کیا گیا۔ اقبال نے اس کی منظر کشی نظم میں یوں کی ہے۔

طارق چوں برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب زروئے شریعت کجا روا ست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر مُلک مِلک ماست کہ ملک خدائے ماست

بحر و بر قدیم فاتحین کی جولانگاہ رہے ہیں۔ مشہور سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافعؓ جب شمالی افریقہ کی تسخیر پر مامور ہوئے تو وہ ایک برقِ جوالہ کی طرح تونس اور الجزائر سے ہوتے ہوئے مراکش پہنچ گئے۔ اور چند ہی دنوں میں بحر ظلمات کی موجیں ان کے قدموں کو چھو رہی تھیں۔ جذبۂ جہاد اور کلمۂ حق کی سربلندی کے شوق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے بے اختیار اپنے گھوڑے کو بحر اٹلانٹک (اوقیانوس) میں ڈال دیا۔ بحر ظلمات دجلہ تو تھا نہیں کہ چند سو گز تیر کر پار ہو جاتے۔ مجبوراً ٹھہر گئے۔ اس وقت شوق وجذبے سے مغلوب ہو کر آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی۔

اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ اِنِّیْ قَدْ بَلَغْتُ الْمَجْھُوْدَ وَلَوْلَا ھٰذَا الْبَحْرُ لَمَضَیْتُ فِی الْبِلَادِ اُقَاتِلُ مَنْ کَفَرَ بِكَ حَتّٰی لَا یُعْبَدَ اَحَدٌ مِنْ دُوْنِكَ!

"اے اللہ گواہ رہ کہ میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ یہ بحر زخّار حائل ہے ورنہ جی چاہتا ہے کہ برابر آگے بڑھتا جاؤں اور بحر و بر میں تیرے نام کی منادی کر دوں"

حضرت عقبہ بن نافعؓ سے قلب کو گرمانے اور روح کو تڑپانے والے بعض نہایت تاریخی جملے مروی ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ اندلس و مراکش کی تاریخ کا مطالعہ اس سلسلے میں مفید ہوگا۔

قوموں اور ملّتوں کی تاریخ میں بعض نہایت نازک موڑ آتے ہیں۔ بعض جری افراد کا عزم مصمم، اور مرد خدا کا یقین اس نازک دور سے ملّتوں کو باہر نکال لاتا ہے، اُمّتِ

اسلامیہ پر ایسا ہی نازک دور رسول پاکؐ کے وصال کے بعد فوراً شروع ہوا۔چار مسائل نے پوری امت کو گھیرے میں لے لیا۔

۱۔ جانشینی کا مسئلہ ۲۔منافقین و مرتدین کی شورش
۳۔ زکوٰۃ دینے سے قبائل کا انکار ۴۔ لشکر اسامہؓ کی روانگی اور ان کی امارت سے انکار

جانشینی کا مسئلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت سے ٹل گیا۔قبائل نماز، روزہ اور حج کو تو تسلیم کرتے تھے لیکن زکوٰۃ سے انکار کرتے تھے۔ دو چار قبائل کو چھوڑ کر سارا ملک یہی کہہ رہا تھا کہ ہم زکوٰۃ میں ایک جانور بھی نہیں دیں گے۔حضرت ابو بکر کی دینی غیرت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم دین کامل کا جو مجموعہ چھوڑ گئے ہیں اس میں ذرّہ برابر بھی کم و کاست ہو۔اس موقع پر آپ کی زبان سے بے ساختہ جو جملہ نکلا تاریخ نے اسے من و عن محفوظ کر لیا ہے۔آپؓ نے فرمایا۔

"اَیُنْقَصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ"،

"کیا دین میں قطع برید ہو اور میں زندہ رہوں"

اب سارا مدینہ اور اکابر صحابہ تک ایک طرف تھے اور مشورہ دیتے تھے کہ ایک رکن کے انکاری سے کس طرح قتال جائز ہے۔زبان صدّیق پھر گویا ہوتی ہے؛

"خدا کی قسم اگر ایک بکری کا بچّہ بھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے روک لیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا"

اس وقت مدینہ چاروں طرف سے شورشوں اور فتنوں سے گھرا ہوا تھا۔کسی بھی وقت حملے کا خطرہ تھا۔ایسے نازک وقت حضرت اسامہؓ کا لشکر جسے رسول اکرم نے علَم باندھا تھا مدینے کے قریب کوچ کا پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ سب کی یہ رائے ہوئی کہ اس نازک وقت میں، مدینے کی حفاظت کے لیے اس لشکر کو روک لینا ضروری ہے۔لیکن حضرت ابو بکرؓ کی نگاہیں کچھ اور دیکھ رہی ہیں۔آپ صاف جواب دیتے ہیں۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں ابو بکرؓ کی جان ہے اگر مجھے اس کا بھی

یقین ہو جائے کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھا لے جائیں گے تب بھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا رمبارک پورا کروں گا اور اسامہؓ کا لشکر بھیج کر رہوں گا۔"

آپ کے اس عزم کے آگے بڑے بڑے صحابہ زچ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ انصار کا پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں کہ "لشکر پر حضرت اسامہؓ سے زیادہ سن رسیدہ آدمی امیر مقرر کیا جائے۔" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ جوش میں کھڑے ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ کر بے ساختہ کہا،

"اللہ کے بندے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہؓ کو مقرر کریں اور تم مجھے مشورہ دو کہ میں ان کو معزول کر دوں"؟

اسلام کو اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ میسر نہ آتے تو اسلام مدینہ میں ہی محبوس ہو کر رہ جاتا۔ آپ کے جملے عزم و ارادے کے مہر نیمروز ہیں۔ اور صرف اسلامی ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ کی اسی عزیمت کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں،

"ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے۔ مگر کام انھوں نے پیغمبروں سا کیا اور انھیں کی سی استقامت اور پختگی دکھائی۔"

جیسا کہ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ زریں اقوال میں سب سے کاٹ دار جملے فاتحین سے وارد ہیں۔ عراق عجم یعنی ایران کی فتح جہاں تلواروں کی چمک اور نیزوں کی جھن کی مرہون منت تھی وہیں اسلامی فاتحین اور وفود کے آبدار جملوں نے بھی ایرانی سپہ سالاروں اور حکمرانوں کے قلوب کو پانی کر کے رکھ دیا تھا۔

جب سعد بن وقاصؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کو سفیر بنا کر رستم کے پاس روانہ کیا تو رستم نے بڑے تکلف اور شان تجمل سے دربار آراستہ کیا۔ سونے کا تخت بچھوایا، اور اس کے چاروں طرف دیبا و حریر اور رومی قالینوں کا فرش کروایا۔ تکیوں اور شامیانوں کی جھالریں سچے موتیوں کی تھیں۔ غرض حضرت ربعیؓ بن عامر اس شان و شوکت والے دربار میں نہایت

بے تکلفی سے داخل ہوئے اور گھوڑے کو ایک گاؤ تکیے سے باندھ کر نیزے کی انی ٹیکتے اور قیمتی فرش کو چھیدتے ہوئے تخت کی طرف بڑھے اور رستم کے برابر جا بیٹھے۔ لوگوں نے ربعی کو تخت سے نیچے اتارنا اور ان کے ہتھیاروں کو الگ کرنا چاہا تو حضرت ربعیؓ نے جواب دیا کہ "میں تمہارے یہاں تمہارے بلانے پر آیا ہوں خود سے نہیں آیا۔ ہمارے مذہب میں اس کی سخت ممانعت ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور باقی آدمی بندوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔"

رستم نے اپنے آدمیوں کو خود روک دیا۔ مگر کچھ سوچ کر حضرت ربعیؓ خود رستم کے پاس سے اٹھے اور خنجر سے قالین اور فرش کو چاک کر کے نیچے سے خالی زمین نکال کر اس پر بیٹھ گئے اور رستم سے مخاطب ہو کر کہا کہ،

"ہم کو تمہارے اس پر تکلف فرش کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے خدا کا بچھایا ہوا فرش زمین ہی کافی ہے۔"

جب رستم نے ترجمان کے ذریعہ جنگ و پیکار کا مقصد پوچھا تو آپ نے جو جواب دیا اس میں دلیری اور بہادری کی بو باس تو ہے ہی لیکن اسلام کی پوری صداقت، پیغام اور حقانیت چند جملوں میں در آئی ہے۔ یہ سفارتی کلمات دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصائح کے ضخیم دفتروں پر بھاری ہیں۔ حضرت ربعیؓ نے جواب دیا۔

"ہم خدا کے بندوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں لانا چاہتے ہیں۔ ظلم اور مذہبی ناانصافی کی جگہ اسلامی انصاف کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر ایک خدا کی بندگی میں دینا چاہتے ہیں، جو شخص عدل و اسلام پر قائم ہو جائے ہم اس سے اور اس کے ملک و اموال سے معترض نہ ہوں گے۔ جو شخص ہمارے راستے میں حائل ہوگا ہم اس سے لڑیں گے یہاں تک کہ جنت میں پہنچ جائیں۔ یا فتح مند ہوں۔ تم جزیہ دینا چاہو تو ہم قبول کریں گے اور تمہارے جان و مال کی حفاظت کے لیے جب بھی ہماری ضرورت ہوگی تمہاری مدد کو موجود ہوں گے۔

رستم اور یزدجرد کے دربار میں اسلامی سفراء کے ایسے ہی کاٹ دار جملوں کی گونج جنگ قادسیہ کے دوران سنی گئی۔ جن میں حضرت حذیفہ بن محصن، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت نعمان بن مقرنؓ، حضرت قیس بن زرارہؓ اور عاصم بن عمرؓ قابل ذکر ہیں۔

بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر ان حوالوں میں ٹیپو سلطان شہید کا نام نہ لیا جائے۔ انگریزوں سے ٹیپو سلطان کی نبرد آزمائی ایک ضرب المثل ہے۔ شہادت پانے سے چند روز پہلے ٹیپو سلطان نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی یورپ کی مختلف زبانوں میں رائج ہے۔ اور وہ تاریخی الفاظ ہیں۔

"گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک سالہ زندگی بہتر ہے"

آزادی کی اس سے بہتر لفظی تصویر اگر کوئی بڑے سے بڑا ادیب یا شاعر بھی کھینچنا چاہے تو اس کے لیے اتنے کم الفاظ میں آزادی کا مرقع پیش کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ پھر ایک بار یاد دلا دیں کہ ٹیپو سلطان شہید ایک فرمانروا اور فاتح تھے، وہ کوئی ادیب، شاعر، یا فلسفی نہ تھے۔

اقوال زرّیں پر انگریزی میں کام ہوا ہے۔ اقوال زرّیں پر مشتمل انگریزی میں اچھی اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ انگریزی اخباروں اور رسائل میں (Thought for The day) پر مشتمل باقاعدہ کسی کالم کا سرنامہ ہوا کرتا ہے۔ اردو اخباروں میں بھی حرفِ دانش وغیرہ کے عنوان کے تحت اقوال زرّیں شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی اکثر مغربی مفکرین کے آزمودہ تصورات یا قرآن وحدیث کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ خالصتاً اقوال زرّیں پر ابھی کام ہونا باقی ہے۔ خدا کرے یہ مقالہ ارباب حل وعقد اور محققین کی بارگاہ میں باریابی حاصل کرے۔ اور نئی نسل کے تازہ دم کھلاڑی اوراق پارینہ کی بازخوانی پر توجہ دیں۔ اور ملّت کے ہاتھوں میں ایک مرتّب، مزیّن اور مجلد ایک ایسا گلدستہ پیش کریں جس میں سن بھی ہوں اور ہر زرّیں مقولہ مع اس کے تاریخی تناظر اور شخصیت کے تعارف کے پیش کیا جائے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی "ابھی" زرخیز ہے ساقی

کتابیات

۱۔ مسلمانوں کا عروج و زوال	مولانا احمد سعید ایم۔اے
۲۔ تاریخ اسلام (حصہ اول)	مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
۳۔ تاریخ اسلام (حصہ سوم)	〃 〃 〃
۴۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۵۔ نبی رحمتؐ	〃 〃 〃
۶۔ سیرت النبیؐ	مولانا شبلی نعمانیؒ
۷۔ خطبات مدراس	مولانا سید سلیمان ندوی
۸۔ المرتضیٰ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۹۔ اصلاحیات	〃 〃 〃
۱۰۔ دو ہفتے مراکش میں	〃 〃 〃
۱۱۔ دارالترجمہ حیدرآباد کی خدمات	
۱۲۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا	سید قاسم محمود
۱۳۔ گل رعنا	حکیم سید عبدالحیؒ
۱۴۔ الفاروق	مولانا شبلی نعمانیؒ
۱۵۔ The Readers Encyclopedia	William Rose Benet
۱۶۔ Cleopetra	G. B. Shan
۱۷۔ The Sword of Tipu Sultan	Gidwani
۱۸۔ تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۱۹۔ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

۲۰- The Life of Muhammad.	Haykal
۲۱- دربار اکبری	مولانا محمد حسین آزاد
۲۲- مقالات شبلی	مولانا شبلی نعمانیؒ
۲۳- مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
۲۴- کلیات اردو	اقبال
۲۵- کلیات فارسی	اقبال
۲۶- دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی ادبی خدمات	ڈاکٹر مجیب الاسلام
۲۷- پرانے چراغ (جلد اوّل)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

محمد خالد ندوی غازیپوری

سماجی وادبی انقلاب میں مواعظ و ملفوظات کا اثر

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور کائنات میں اشرف و اعلیٰ مقام پر فائز کیا، قوت تمیز سے اسے نوازا اور خیر و شر کے ادراک پر اسے قدرت عطا فرمائی۔ زبان و بیان کی دولت سے اسے بہرہ ور فرمایا اور یہ ایسا امتیاز ہے جس کی وجہ سے ساری مخلوق میں برتری و تفوق کا مستحق اسے گردانا گیا حقیقت میں اللہ کی ساری نعمتیں اس کے لیے، اور وہ خود اللہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سماج میں ہمیشہ دو طبقے رہے ہیں، ایک طبقہ جو نیک کردار، نیک گفتار، نیک خو، نیک سیرت، ہمدرد، غمگسار، بہی خواہ اور انسانیت کے لیے فوز و فلاح کا ضامن ہوتا ہے، جب کہ دوسرا طبقہ مردم آزاری، ہوس گیری، ظلم و زیادتی، عناد و سرکشی، تمرد و نافرمانی میں حد سے تجاوز اور خواہشات کی اتباع میں ہر قید سے آزاد ہوتا ہے۔

اسی طرح اقتصادی نابرابری کی وجہ سے ہماری سوسائٹی دو طبقوں میں بٹی نظر آتی ہے یعنی بہت امیر یا بہت غریب امراء نے معاشرت کے تمام وسائل پر اپنا قبضہ و تسلط ہر دور میں قائم رکھا اور انھیں عام آدمی کے حالات و مسائل سے صرف اتنا ہی سروکار تھا جتنا ان کے مفاد میں ہو سکتا تھا ایک عام آدمی جو غریب یا محنت کش ہو، یا ایک ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ انسان اپنے دل کا درد خدا سے کہہ تو سکتا تھا، خداوند سے نہیں، جاگیرداری نظام میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک غریب اور

بے حیثیت انسان کسی نواب یا راجا یا بادشاہ کی محفل میں بیٹھ کر اسے اپنا دکھڑا اسطرح سنا سکے گا جس سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

لیکن اللہ والے جنھوں نے دلوں کی دنیا میں اپنی روحانی حکومت قائم کر رکھی تھی وہ خود کو ہمیشہ عوام اور مساکین کے طبقے ہی سے متعلق سمجھتے تھے اور ان کے تمام مسائل سے براہ راست اور سچی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی خانقاہوں میں جو غریب، نادار، مصیبت زدہ اور مظلوم انسان آتے تھے انھیں ڈھارس بندھتی تھی اور ان کے زخموں کا مرہم ملتا تھا۔ اس لیے عوام پر اللہ والوں، صوفیا، بزرگوں اور اہل دل علما، کا اثر، امرا، اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اسی لیے معاشرت اور ثقافت کے وہ پہلو، جو عوامی اشتراک کا مظہر ہوتے ہیں ان میں ان بزرگوں کا اثر و نفوذ پایا جاتا ہے اور انھیں صحیح رخ دینے اور زندگی کی حلاوتوں سے آشنا کرنے اور معاشرت کی رفعتوں سے ہمکنار کرنے میں ان کے کردار و گفتار کا بڑا مؤثر رول رہا ہے، ان کے نظریات عوامی نظریات کو متاثر کرتے ہیں، ان کے فکر و خیال کے مروارید کی جگمگاہٹ سے فکر و تخیل کو جلا، اور شعور و ادراک کے آفاق میں کہکشاں کی تنویر نظر آتی ہے۔ ان کی محبت کی شمامۂ جانفزا مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ ان کا وجود بیکس پناہی کا مظہر۔ اور ان کی سیرت آئینہ حیات بن کر خوب سے خوب تر کی تحریک پیدا کرتی ہے، ان کی زاہدانہ زندگی کے اثرات سے حکومت بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ محض صاحب قال اور صاحب کمال نہیں ہوتے بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل سے نکلتا ہے، اس لیے دل پر اثر کرتا ہے، جس وقت تقریر کرتے ہیں، سراپا درد واثر ہوتے ہیں اسی لیے ان میں مقناطیس کی سی کشش ہوتی ہے جو ہر ٹھوس صلب آہن کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد تابعین کے دور کا ہم اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے

جنھوں نے اپنی قوتِ ایمانی، سوزِ دروں، صحبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان سے تنکے کی طرح بہنے سے بچایا اور مادیت کے سیلاب کی رفتار اگر ختم نہیں کیا تو سست ضرور کر دیا۔ مادیت کا وہ سیلاب جس کا برملا اظہار سرورِ عالم نبی آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یوں فرمایا تھا:

"ما الفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخشیٰ علیکم ان تبسط الدنیا علیکم کما بسطت علیٰ من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلکم کما اھلکتھم"

مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر ایسی کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دو اور تم کو وہ بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا۔"

اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے فضلاء تابعین کی ایک سربرآوردہ جماعت تھی جس میں سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ، شعبیؒ کے علاوہ حضرت حسن بصریؒ کو خاص امتیاز و تفوق حاصل تھا۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

"حضرت حسن بصری کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں۔ ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی بے وفائی اور آخرت کی اہمیت کا مضمون ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم، طول امل اور فریب نفس کی مذمت ملتی ہے اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، انھیں مضامین کی ضرورت تھی، ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں۔

حضرت حسن بصری کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل

ہے کہ انہوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح حسن بصریؒ کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لیے کہ ان کی تقریریں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی۔

غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے۔" (ص۵۸ تا ص۶۶ تلخیص تاریخ دعوت و عزیمت)،

بنی امیہ کے زوال کے بعد بنی عباس کا دور شروع ہوا۔ عجمی عنصر کے غلبہ سے سیرت و کردار کے ساتھ زبان بھی متاثر ہوئی۔ معاشرت میں عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا، جاہ پسندی، زر طلبی، عہدوں اور مناصب کے چکروں نے پوری سوسائٹی کو متاثر کیا۔ لیکن اس عیش و عشرت کا ماحول میں کچھ نفوس قدسیہ تھے جو اسلامی اندوختہ کو بچانے اور اسلامی ورثہ کی حفاظت میں پیش پیش تھے۔ مادیت کے تلاطم خیز سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے اور ان کا عوامی زندگی میں اتنا زبردست اثر تھا کہ کبھی کبھی خلیفہ وقت کو بھی ان کی مقبولیت کو دیکھ کر یہ کہنا پڑا:۔ "کہ یہ ہے حقیقی بادشاہی"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بغداد میں ۳۰ سال گذارے، عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستنصر باللہ ابو العباس م ۵۱۲ھ کا عہد تھا ان کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد، المقتفی لامر اللہ اور المستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔ شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے۔

سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی آویزشوں سے جو الم انگیز واقعات رونما ہوئے ان کا بہت قریب سے انہوں نے مشاہدہ کیا، سماجی بدحالی نے انھیں متاثر کیا، لہٰذا عوام کی اصلاح و تربیت کے لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پوری قوت کے ساتھ وعظ وارشاد، دعوت و تربیت، اصلاحِ نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپ کا وعظ جو ربانی فتوحات، یزدانی الہامات اور سبحانی ارشادات وہدایات کا سمندر ہوتا تھا جس وقت جوش میں آتا تو سامعین بیتاب ہو جاتے، آپ کی مجلس وعظ میں، امراء، فقراء، رؤسا، درویش، سلاطین، وزراء، علماء، صلحاء، زاہدین وعابدین، معتزلہ ومبتدعین، دنیادار ودیندار، مشائخ، مریدین، فصحا، شعراء، اہل سیف، اہل قلم، ضعفاء اقویاء، سخت دل، نرم دل، اہل شہر واہل دیہات، عوام وخواص غرض ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ کفار ومشرکین، یہود ونصاریٰ بھی شریک ہوتے تھے۔ حاضرین سامعین کا ایک سمندر آپ کے رو برو ہوتا، لہٰذا جب حکمت انش، کے ابرنیساں کی موسلادھار بارش برسنی شروع ہو جاتی تو کسی پر وجد طاری ہو جاتا کسی پر یہ گریہ وبکار، کوئی محو حیرت استغراقی کیفیت میں ششدر بیٹھا رہ جاتا تھا اور کوئی مضطرب وبے اختیار ہو کر کپڑے پھاڑتا اور چیختا چلاتا ہوا پچھاڑیں کھایا کرتا تھا، اس میں یہ حالت بھی ہوتی تھی کہ کوئی اپنے قلب کی کوئی چوٹ ضبط نہ کر سکا تو اس کا جگر شق ہوا اور شمشیر محبت کا گھائل ہو کر شہادت لقاء محبوب کا شربت پیا اور موت کی نیند پڑ کر سو گیا۔ وعظ کے ختم ہونے پر جب حاضرین منتشر ہوتے تو مئے معرفت کے متوالوں اور شہدائے عشق کی نعشوں کا پتہ چلتا تھا کہ آج اتنے جنازے اٹھانے کی نوبت آئی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے ان کے وعظ کی تاثیر کے ذیل میں لکھا ہے:

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر رکھتے تھے اور تاثیر آج بھی آپ کے کلام کی موجود ہے، فتوح الغیب اور فتح الربانی کے مضامین اور آپ کے مجالس وعظ

کے ملفوظات آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں۔ ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ تاثیر اور عام نفع کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے وہ دل سے نکلتا تھا، اس لیے دل پر اثر کرتا تھا۔ آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے اور دلآویزی اور حلاوت بھی اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

ایک مجلس میں قلب کے صلاح و فساد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "قلب کا سونا پرہیزگاری، حق تعالیٰ پر توکل، اس کی توحید، اور اعمال میں اخلاص پیدا کرنے سے ہے اور اس کا بگڑنا ان خصلتوں کے معدوم ہونے سے، قلب گویا پرندہ ہے بدن کے پنجرہ میں، گویا موتی ہے ڈبہ میں، گویا مال ہے صندوق میں، پس اعتبار پرند کا ہے پنجرہ کا نہیں ہے، اعتبار موتی کا ہے ڈبہ کا نہیں ہے، اور مال کا ہے صندوق کا نہیں ہے۔" (فتوح یزدانی ص۱۳)

کبھی معاشرہ کے اس طبقہ کو جو معاشی اعتبار سے کمزور ہونے کی وجہ سے اہل ثروت کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اپنے اعمال و اخلاق کی رفعتوں کو بھول جاتا تھا یوں مخاطب کرتے ہیں:

اے خالی ہاتھ فقیر، اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے۔ اے گمنام، اے بھوکے، پیاسے ننگے، جگر جھلسے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھٹکارے ہوئے، اے وہ کہ ہر مراد سے محروم خاک پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں بٹی ہوئی، آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں) کے پشتے لگے ہیں ہمت کہہ کے کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا اور جمعیت (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفالت نہ کی، مجھے گمنام کیا اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گذرتے ہیں، اسے

مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی۔ حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی۔ اور ایک ماں باپ آدم و حواؑ کی اولاد میں دونوں ہیں۔"

اے فقیر! خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے کیا ہے کہ تیری سرشت مٹیار زمین (کے مثل) بے ریت ہے اور رحمتِ حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرداگرد ہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیخ اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کلّے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں۔ اس بارہ میں خداوند قدوس تیرے حکم سے فارغ ہے، اس نے آخرت میں تجھ کو جو مقام بخشا ہے اور اس میں تجھ کو مالک بنانا ہے اور عقبیٰ میں تیرے لیے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں اور کسی انسان کے دل میں خیال گزریں۔

"اے فقیر! دولت مند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی اس کا ٹکاؤ انھیں چیزوں سے ہے، جو مالِ دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں۔ اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار پیدا ہو جائے گا۔ اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا۔ البتہ اگر خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین، علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ علیحدہ ہو جانے کی پرواہ نہ ہو گی۔ (دعوت و عزیمت جلد ا ص ۲۱۴)

ایک جگہ سرکاری علماء و مشائخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو اس سے کیا نسبت، اے اللہ اور

اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگانِ خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں مبتلا ہو۔ یہ نفاق کب تک رہے گا۔ اے عالمو! اور اے زاہدو! شاہان وسلاطین کیلئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان سے دنیا کا زر و مال اور اس کی شہوات ولذات لیتے رہو۔ تم اور اکثر بادشاہ اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں۔ بارالٰہا! منافقوں کی شوکت توڑ دے، اور ان کو ذلیل فرما یا ان کو توبہ کی توفیق دے اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے یا ان کی اصلاح فرما۔ (ص ۲۱۷ جلد ۱)

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے۔ اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے، اس کو درست کر دیں۔ یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی، سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیئے۔ اے سورج! اے چاند! اے دن، تم سب آؤ۔" (جلد ۱ ص ۲۱۸)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد اس میدان میں علامہ ابن جوزی نے بڑا اہم رول ادا کیا، ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ و مجالس درس و ملفوظات ہیں، تاثیر کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد و شوق میں گریبان پھاڑتے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ ہوتا۔ ان کی مجالس وعظ کی مقبولیت اور لوگوں کے اژدہام کا ایک بڑا سبب ان کی فصاحت و بلاغت اور دل نشیں انداز میں حسن خطابت کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مدظلہ العالی نے اس طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

"انہوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں اور الفاظ کی طرف توجہ نہ کریں۔ یہ سب تکلف اور تصنع ہے، لیکن انہوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا اور

اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خداداد قابلیت ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے، نہ کہ نقص و عیب۔ اس لیے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہیئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیئے۔" (ص ۲۵)

اس طرح ان اہل دل بزرگوں نے نہ صرف اپنے مواعظ کے ذریعہ دلوں کی دنیا بدل دی۔ بلکہ زبان و ادب کے دامن کو بھی مالا مال و نہال کیا۔ ادب رفیع کے وہ نمونے چھوڑے جس سے بہتر و شاہکار اور موثر ادب کا تصور نہیں کیا جاسکتا، ادب کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے، اور یہ اہل دل بزرگ زندگی کے رزم و بزم سے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ جس سے زیادہ کا تصور دوسرے طبقۂ انسانی سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جہاں سیرت کا نہال برگ و بار سے مالا مال ان کی صحبت فیض کے اثر سے لازوال ہوجاتا ہے، وہیں ادب کی چاشنی و حلاوت، استعارے، تلمیحات، کنایات، محاورات اور محاکات کا بانکپن بھی ان کے مواعظ و ملفوظات کی روح کی بندگی کی عکاسی کرتا ہے، اس تناظر میں فوائد الفواد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ سرور الصدور و نور البدور، اسی طرح سیر الاولیاء، احسن الاقوال اور خیر المجالس اور راحت القلوب جو بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات پر مشتمل ہیں، کا مطالعہ بھی اس عقلیت و تاثیر کا اہم ماخذ ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

"ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے آخر تک سات سو سال میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اس پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اکثریت انھیں اہل دل کی ہے یا ان سے وابستہ افراد کی ہے، اسی طرح اردو ادب میں نظم و نثر کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں، وہ ان بزرگوں کے خانقاہوں میں ڈھالے گئے ہیں۔ قدیم کتب ملفوظات کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کا کینڈا انھیں بزرگوں نے بنایا ہے اور اس زبان میں جو تاثیر و گھلاوٹ ہے، وہ ان بزرگوں کی عوام دوستی کا ہی پرتو ہے"
(نقد ملفوظات)

یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ اور مشائخ کی صحبتیں، ان کے مجالس، ان کے ارشادات و افادات، ان کے ہدایات و ملفوظات اور بعض اوقات ان کی دل نواز نگاہیں نسخۂ اکسیر ثابت ہوتی ہیں۔

مشہور ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ جب رائے بریلی سے لکھنؤ تشریف لائے اور ٹیلہ والی مسجد میں قیام پذیر ہوئے تو اہل لکھنؤ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور توبہ و انابت کے ساتھ روحانی زندگی کی تازگی، سکینت، نشاط انگیزی اور باطنی تسکین اور روح کی بالیدگی پاتے۔ ذہن و فکر میں ایک عظیم انقلاب محسوس کرتے۔ اس کا اثر ایوانِ حکومت میں محسوس کیا جانے لگا۔ نواب اودھ کی طرف سے بعض پیشکشیں بھی ہوئیں۔ دھمکی کا انداز بھی اختیار کیا گیا، اوباش بھی لگائے گئے، یہاں تک کہ ایک روز کچھ ڈاکو حاضر خدمت ہوئے، ان میں ان کا سردار بھی تھا۔ ان کے آنے کا مقصد کچھ اور تھا لیکن آپ کی مجلس میں شریک ہوئے۔ گفتگو سنی تو دل تڑپ اٹھا کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان کے ایک ایک بول کی تراوٹ سے نہال ایمان پر تازگی کے ساتھ اہتزاز کی کیفیت طاری ہوگئی، جو مدتوں سے معصیت کی پرشور وادی میں فنا و بقا کی کشمکش سے دوچار تھا، ایک ہی نظر نے دل کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی اور رہزن سے رہبر کی صفوں میں داخل ہوگئے یہاں تک کہ جب ان کے دوسرے ساتھیوں نے عادت کے مطابق کہیں رہزنی یا شب خوں مارنے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے نہ صرف اس میں کوئی دلچسپی ظاہر کی بلکہ ان سے بھی حق و صواب کی ڈگر اختیار کرنے کیلئے حضرت سید صاحب کے مجلس کے اثرات اور اپنے توبہ و انابت کا تذکرہ کیا۔ اور انھیں بھی لے کر آئے اور یہ پوری جماعت جن کا پیشہ رہزنی اور چوری تھا، اہل دل کی صفوں میں داخل ہوگئے۔ دینِ اسلام اور مخلوق خدا کی بہی خواہی ان کا شعار بن گیا۔ اس طرح وہ سماجی انقلاب وجود پذیر ہوا جو اپنی صالحیت، افادیت اصالت اور نافعیت میں قرن اول کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

دل کا رخ جب صحیح ہوجاتا ہے تو زبان و قلم کے رشحات و نگارشات میں صالحیت

کا عکس جمیل نظر آنے لگتا ہے، وہی مومن خاں مومن، جو رنگین مزاج اور عشق شعار تھے حضرت سید صاحب کی ارادت میں آتے ہی ان کا فکری رخ ایسا تبدیل ہوا کہ اب وہ خود کہہ رہے ہیں۔

مومن تجھے کچھ بھی ہے جو پاس ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیجئے وہاں
انصاف کرو، خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پہ قرباں

آگے وہ کہتے ہیں۔

پلا مجھکو ساقی شراب طہور کہ اعضا شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا کہ آجائے بس نشۂ اسلام کا
بہت کوشش و جاں نثاری کروں کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم سزاوار گردن فرازی ہو تم
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ مسرور ہوں

ان کے علاوہ اور بھی شعراء، ادباء حضرت سید صاحب کی تحریک اصلاح و جہاد سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کی تالیفات و تصنیفات اور کلام خالص اسلامی ادب کے نمونے بن گئے۔

جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

تحریک جہاد کے بعد جو شعراء صف اول میں آتے ہیں، ان میں ایک ٹھہراؤ اور وقار محسوس ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نام پر تضحیک کا جو عنصر تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس دور کے سرخیل شعراء میں استاد ذوق کے یہاں بھی وہ ابتذال نہیں ہے جو ان کے متقدمین کے کلام کا ناقابل انکار عنصر تھا،

ایک زمین ہے "زباں کے لیے" آسماں کے لیے"۔ اس میں استاد ذوق کے یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ وہ اپنے پیش رو شعراء سے مختلف نظر آتے ہیں اور ان کے کلام میں بالواسطہ ایک اسلامی دعوت کا اثر نمایاں ہے۔ کہتے ہیں :

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
نہیں ثبات بلندی دعوتِ دوشاں کیلئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے
بیان درد و محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زباں نہ دل کیلئے ہے، نہ دل زباں کیلئے
مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور
کہ جان دی کہ تری روئے عرق فشاں کیلئے

یہ وہی زمین ہے جس میں مومن کی مشہور غزل ہے۔

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کیلئے
عبث میں خاک ہوا میل آسماں کیلئے
نوید امن ہے بیداد، دوست جاں کیلئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

(کاروانِ ادب صفحہ، اپریل، جون ۱۹۹۵ء)

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی بلند قامت شخصیت، پر مغز وعظ، دلنشیں ملفوظات اور امت کے لیے تڑپ کے وہ اثرات ظاہر ہوئے جن سے ایک عام ذہنی مزاج و رجحان کی تشکیل ہوئی اور قوم کا مزاج ان کاوشوں کے نتیجے میں ایسا بن گیا کہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے فاضل انگریزی کے علمی انشار پرداز مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو بھی خادم کعبہ کا لباس پہن کر آنا پڑا جب کہیں وہ مسلمان قوم کی لیڈری کے مستحق ہوئے اور وہ ادب مقبول ہوا جس میں زندگی اور مذہب کی جھلک نمایاں ہو۔

ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی

ملفوظات

وہ لفظ جو منہ سے نکلے اور با معنی ہو وہ ملفوظات میں شامل ہے۔ ملفوظات کا لفظ عام طور پر اولیاء اللہ، صوفیاء کرام، بزرگان دین اور اللہ تعالیٰ کے مخصوص نیک بندوں کے اقوال گفتگو، زبانی کلمات، اور روزانہ کی محفلوں اور مجلسوں کے پند و نصائح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تصوف و سلوک کے منازل طے کئے ہوئے اشخاص اور معرفت الٰہی سے سرشار افراد کی حکیمانہ گفتگو، سادہ و دل نشیں پیرایۂ بیان میں اظہار کئے ہوئے خیالات و افکار ملفوظات کہلاتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ملفوظات میں تصوف کا عنصر غالب ہے، اور انسانی زندگی کی ان باتوں کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، جن کا تعلق عبادت و ریاضت، شریعت و طریقت، طاعت الٰہی، حبِ رسولؐ اوامر و نواہی، قناعت و توکل، زہد و تقویٰ اور پرہیز گاری سے ہے، ان باتوں میں چونکہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا پہلو شامل ہے، اس لئے وہ ادب ہے،

جب ملفوظات کو ادبِ اسلامی کے اصناف میں شامل کیا جائے گا تو خالص دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے ملفوظات کے مضامین و موضوعات، افکار و اسالیب، وجدان و احساس کے مأخذ اور رجحانات کا جائزہ ضروری ہے، غیر دینی و غیر شرعی عناصر کی طرف اشارہ لازمی ہے، جو بھی باطل افکار تصوف میں شامل ہو گئے ہیں، قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا تجزیہ کئے بغیر ملفوظات کا ادبی و اسلامی معیار متعین نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے خاص طور سے تصوف کا تاریخی جائزہ اور ملفوظات کے

فنی تجزیہ کی ضرورت ہے۔

تصوّف کی تاریخ جس قدر قدیم ہے، ملفوظات کی تاریخ بھی اسی قدر قدیم ہے تصوف جس کی تزکیہ و احسان سے بھی تعبیر کی جاتی ہے، اہل تحقیق نے اپنے ذوق و مذاق اور اپنی فکر و کاوش کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم، صحابۂ کرام اور بعض نے تابعین یا تبع تابعین سے اس کا سرا ملایا ہے، اللہ تعالےٰ کے نیک بندوں نے جو شریعت پر عمل پیرا تھے، رضاء الٰہی کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لئے دنیا کے معاملات سے کم دلچسپی لیکر عبادت، ریاضت اور مجاہدہ میں زیادہ دلچسپی لی، اور انھوں نے اپنے لئے عبادت الٰہی کو زندگی کا حقیقی مقصد قرار دیا، ان نیک بندوں نے جو گفتگو کی، اس میں ان کی ذات کو سنوارنے کی فکر کے ساتھ فرد و معاشرہ کو بنانے و سنوارنے کی فکر بھی شامل تھی، ابتدائی دور کے اولیاء اللہ کے ملفوظات عام طور پر جمع نہیں کئے گئے، وہ اقوال کی صورت میں کتابوں میں جا بجا منتشر ہیں، حسن بصری، رابعہ عدویہ اور دوسروں کے نام لئے جاسکتے ہیں، ان کے اقوال حکیمانہ اور پیرایۂ بیان دل نشیں ہیں، ان اولیاء اللہ کے اعمال کا تعلق خالص دینی شعار سے تھا، جو لوگ ان کے اعمال و اذکار کو رہبانیت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے تعلیمات کو رہبانیت کی تلقین سمجھتے ہیں وہ حق پر نہیں ہیں، عباس محمود العقاد نے رابعہ عدویہ کے متعلق تحریر کیا: رابعة العدوية لماذا ينكرها أهل السنة" کے عنوان کے تحت تحریر کیا:۔

" لانهم عابوا على السيدة "المتصوفة" أنها كانت تصلي ألف ركعة في الليلة مع أن الله خفف الصلاة عن عباده من خمسين إلى خمس، وكانت تسأل عن ذلك فتقول إنها لا تريد ثوابا. انما أفعله لكي يسوء به رسول الله صلى الله يوم القيامة فيقول للأنبياء: انظروا إلى إمرة من أمتي هذا عملها، مع أن المسلم

کما قال أنصار السنة یأتی بالأعمال الصالحة
وَ ینتظر ثواب اللہ" (۱)

اسلامی تصوف کا سرچشمہ قرآن و حدیث اور شریعت دین متین ہے، تصوف اسلام سے کوئی خارجی شئے نہیں ہے، اس لیے جب تصوّف سے متعلق کسی مواد کا تجزیہ کیا جائے گا تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ ابتدائی دور کے مسلمان اور تصوف کے متعلق مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ جنھوں نے علم و عرفان کی بادہ نوشی کے ساتھ طریقت کی میخواری بھی کی، وہ تحریر کرتے ہیں :

"اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے مسلمان تھے، پھر صوفی، وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت سے نہیں لاتے تھے، بلکہ اسلام کے تحت اس کی پاکیزہ ترین صورت کو کہتے تھے، وہ اپنے اسلام کو اپنے تصوّف پر مقدّم رکھتے تھے، اور تصوف کو محض اس لئے عزیز و محبوب رکھتے تھے کہ وہ ان کی نظر میں اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی" (۲)

اسلامی تصوّف کی حقیقت اور اس کے بنیادی پہلوؤں کے متعلق گفت گو کرتے ہوئے مولانا دریا بادی تحریر کرتے ہیں :

"قدیم اکابر صوفیہ کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنّت میں انتہائی سعی کی جائے، اسوۂ رسولؐ اور صحابہؓ کو دلیل راہ رکھا جائے اور اوامر و نواہی کی تعمیل کی جائے، طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ سے رکھا جائے، نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے، صفائے معاملات، و تزکیۂ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پائے" (۳)

۱۔ العقاد۔ یومیات الجزء الرابع ص ۶۳۳۔

۲۔ عبد الماجد دریا بادی۔ تصوف اسلام ص ۱۴ و ۱۵ (۳) ایضاً۔

اولیاء اللہ اور صوفیاء کے اعمال واقوال دونوں ہی دین اسلام کا منظہر ہیں، لیکن عجمیت، یونانی فلسفہ، اور دوسرے مذاہب کے مجاہدہ اور ریاضت کے طریقے تصوّف میں شامل ہوجانے کی وجہ سے تصوّف خالص اسلامی نہیں رہا جب تصوّف خالص اسلامی نہیں رہا تو تمام صوفیاء کے اقوال واعمال بھی خالص اسلامی نہیں رہے، تصوّف میں اس قدر فلسفہ داخل ہوگیا کہ اصطلاحات اور غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہوگیا۔ لوگ مجاہدہ وریاضت کے بغیر شریعت اسلامی کی پابندی کئے بغیر رنگین عبا وچغا میں صوفی کہلانے لگے۔ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے علاّمہ سیّد سلیمانؒ ندوی نے فرمایا :

جاہل اور بازاری صوفیوں نے تصوف کا ناس کر دیا" لطائف ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: تصوف جو سراسر عمل تھا، اسے فلسفہ بنادیا، اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا" اور سیّد صاحب نے فرمایا: اس وقت دنیا میں تین قسم کا تصوّف ہے، ایک ملحدانہ (یا فلسفیانہ) تصوف، دوسرا عامیانہ یا بازاری تصوف، تیسرا صحیح اور اسلامی تصوف اور وہی حق ہے۔" (۱)

ظاہر ہے کہ تصوّف سراپا عمل ہے، اور اسلامی تصوف کی بنیاد قرآن وحدیث ہے اسی لئے وہ صوفیاء جن کا عمل دین وشریعت کے مطابق تھے، ان کے اقوال بھی دین و وشریعت اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھے، فلسفہ اور فلسفیانہ باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، علاّمہ اقبال نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے :

"صوفیہ کے اس پہلے طبقہ میں حضرت فضیل ابن عباس، حضرت ابراہیم ادھم، حضرت معروف کرخی اور شفیق بلخی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہ لوگ ذات باری اور نظام عالم کے حقائق کے متعلق کوئی موشگافی نہیں کرتے، اور نہ ان کا تصوف جو سراپا عمل ہے کوئی فلسفیانہ پہلو رکھتا ہے" ؎۲

؎۱ سلوک سلیمانی: مرتبہ: محمد اشرف خاں. جلد اول ص ۲۷۹ و ۲۸۰

؎۲ علاّمہ اقبال ـ تاریخ تصوف ـ ص ۵۴

فلسفیانہ موشگافی کس طرح شروع ہوئی، اور تصوف جو خالص سراسر عمل تھا، وہ فلسفیانہ افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ کیسے بن گیا؟ اور علماء نے ایسے تصوف سے اختلاف کیوں کیا؟ علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں:

"علماء کی مخالفت کا سلسلہ حقیقت میں حضرت ذوالنون مصری سے شروع ہو جاتا ہے جنھوں نے بقول مولانا جامی سب سے پہلے علم باطن سے اشارات کو عبادت میں منتقل کیا، اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی نکتۂ خیال سے زہد و عبادت کا مقصد اطاعت باری تعالیٰ ہے، یا قلب میں وہ کیفیت پیدا کرنا ہے جس کو روحانی سکینت کہتے ہیں، یہی روحانی سکینت اوائل صوفیاء کا نصب العین تھا مگر بعض بزرگوں کو یہ احساس ہوا۔ کہ قلب کی وہ کیفیت جس سے فوق الادراک حقائق کے متعلق اطمینان و سکون ہو جاتا ہے، محض قلبی سکینت پر نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ اور آفرینش نظام عالم کے حقائق معلوم کرنے کا مخفی ذریعہ بھی ہے، کہتے ہیں کہ جب ابوالخیر اور بوعلی سینا میں ملاقات ہوئی تو ابوالخیر نے کہا جس شئے کو میں دیکھتا ہوں، بوعلی سینا اسے جانتے ہے، بوعلی سینا نے جواب میں کہا جس شئے کو میں جانتا ہوں ابوالخیر اسے دیکھتا ہے، یہی دیکھنے اور جاننے کا نام علم و معرفت کا فرق ہے جس کو ہم تاریخ تصوف کے اس مرحلے پر پیدا ہوتا ہوا معلوم کرتے ہیں، حضرت معروف کرخی نے اس امتیاز کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔" [1]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا:

"حضرت شیخ جیلانی بلکہ ان کے مرید با اختصاص اور بانی سلسلۂ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک کی تصانیف میں اسلامی عنصر قائم اور یہی رنگ غالب ہے اس زمانے کے بعد شیخ ابن عربی کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا

---

[1] علامہ اقبال۔ تاریخ تصوف ص ۵۵۔

وحدت وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے۔" [1]

یہ بات بالکل متفق علیہ ہے کہ یونانی فلسفہ کے مطالعہ کے نتیجہ میں یونانی فلسفہ کا اثر تصوف پر بھی ہوا، ڈاکٹر میر ولی الدین جنھوں نے تصوف، اور عملی تصوف کا جائزہ قرآن و سنت کی روشنی میں لیا ہے، اگرچہ تنزلات ستہ کے دائرہ سے وہ بھی باہر نہیں آسکے ہیں۔ انھوں نے فلسفہ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

" تصوف میں زندقہ کی آمیزش کے دو اسباب ہیں ۱۔ مشائیت ۲۔ اشراقیت" [2]

میر ولی الدین مزید تحریر کرتے ہیں:۔

" تصوف میں اشراقیت کے داخل ہونے کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شئی کی غیریت ذاتیہ کا انکار کر دیا گیا، قرآن میں خلق کی غیریت صریح طور پر ملتی ہے، فلاطینوس (جس کو بعد میں فلاطون الٰہی بھی پکارا جانے لگا) کی تعلیمات کے زیر اثر شئی کو غیر ذات حق نہیں بلکہ عین ذات حق قرار دیا گیا۔ حق ہی حق ہے، غیر حق ذاتاً و وجوداً معدوم۔ باعتبار شئی ہمہ اوست، صحیح عقیدہ مان لیا گیا ہے، ذات شئی اور غیریت شئی کی نفی کا لازمی نتیجہ اباحت و زندقہ تھا، اتباع شریعت کا جوا نکال پھینکنے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ شریعت کو ناقصین کا شعار قرار دیا گیا۔ کاملین کو اس کے اتباع کی ضرورت نہیں بتائی گئی" [3]

اشراقیت کا نتیجہ صرف اتنا ہی نہیں نکلا بلکہ اس کے علاوہ جو خرابیاں پیدا ہوئیں اس کے متعلق میر ولی الدین تحریر کرتے ہیں:۔

" اشراقیت کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ شئی غیر مقصود کو مقصود قرار دے لیا گیا، اور مقصود کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا، اب "کمالات" کو جو محض توابع ہیں اور حصول مقصود کے بعد خود بخود پیدا ہوتے ہیں، اصل مقصود قرار دیا جانے لگا۔ لذات و احوال، کشف کونی تصرفات و کرامات

---

[1] عبدالماجد دریابادی۔ تصوف اسلام۔ ص ۱۵

[2] میر ولی الدین ــ قرآن اور تصوف ــ ص ۲۳

[3] ایضاً ص ۲۳ و ۲۴

وجد و حال، رویائے صادقہ وغیرہ مسالک کی غایت قرار پائے۔ اور ان کو بزرگی اور تقویٰ کی علامت خاص خیال کیا جانے لگا۔ ان کمالات کے حصول کے لیے غیر مسنون مشقوں اور مشغلوں کی ابتدا ہوئی۔ جوگیوں اور سنیاسیوں تک سے بھی اشغال وغیرہ کے سیکھنے میں دریغ نہیں کیا گیا۔ اور اس طرح کے ہندی مراسم اور یونانی تخیلات و نظریات کا ایک معجون مرکب پیدا ہوا، جو اسلامی تصوّف کے نام سے مشہور ہوا۔" (۱)

رضاء الٰہی اور روحانی سکینت کے لیے اسلام نے تزکیۂ و احسان کی تعلیم دی، تصوف میں تزکیہ و احسان کے نام پر جو غیر اسلامی شعار شامل ہو گئے، اور جو لوگ اسی کو اسلامی تصوّف سمجھتے ہیں، مولانا محمد اویس نگرامیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا :-

" وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف فلسفۂ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور ہندو جوگ سے ماخوذ ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

فلسفۂ اشراق اور ہندو جوگ میں چند ریاضتوں اور مجاہدوں کے سوا کیا ہے؟ وہ انھیں مجاہدوں اور انھیں محنتوں کو مقصود حقیقی جانتے ہیں، اور اس کے برعکس ہمارے صوفیہ صافیہ ان ریاضتوں اور مجاہدوں کو جن کے ساتھ اتباع شریعت نہ ہو، کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں، حضرت مجدّد الف ثانی ارشاد فرماتے ہیں :-

" وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلید سنّت سے الگ ہو کر اختیار کئے جائیں معتبر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں (جلد اول مکتوب دوصد و بست و یکم)" (۲)

ان کی یہ تحریر بھی قابل توجہ ہے :

---

(۱) میر ولی الدین - قرآن اور تصوّف - ص - ۲۴

(۲) تصوف کیا ہے۔ مجموعۂ مقالات، مرتبہ - محمد منظور نعمانی - ص : ۵۸

"تصوف کی مشہور و متداول کتابیں سامنے رکھئے.... ان کتابوں کے صرف ابواب پر نظر ڈال لیجیے اور فیصلہ کیجئے کہ ان کتابوں میں توحید اور اس کے احوال اتباع سنت، عبادات کی خشوع وخضوع کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیۂ اخلاق کے سوا کیا ہے؟" ۱؎

تصوّف اسلامی کا مقصد احکام الٰہی پر عمل کرنا اور سنت نبوی کو شب و روز کی زندگی میں اپنانا ہے، مولانا محمد الیاسؒ نے فرمایا:۔

"طریقت کی خاص عنایت ہے اللہ تعالیٰ کے احکام وا وامر کا مرغوب طبعی اور نواہی کا مکروہ طبعی ہوجانا..... یہ تو طریقت کی غایت ہے باقی جو کچھ ہے (یعنی خاص اذکار و اشغال اور مخصوص ریاضات وغیرہ) سو وہ اس کی تحصیل کے ذرائع ہیں، لیکن اب بہت سے لوگ ان ذرائع ہی کو اصل طریق سمجھنے لگے، حالانکہ بعض تو ان میں سے بدعت ہیں" ۲؎

اتّباعِ شریعت ہی اصل تصوّف ہے، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے فرمایا کہ:

"غوث ہو یا قطب۔جو خلاف شرع کرے وہ کچھ بھی نہیں" ۳؎

مزید فرمایا:

"اتباع سنّت، یہی غوثیت اور قطبیت ہے" ۴؎

ولایت کے متعلق انھوں نے فرمایا:

"ولایت اس کو کہتے ہیں کہ احکام شریعت بے تکلف ہونے لگیں اور افعال شریعت ایسے ہو جائیں کہ گویا امور طبعی ہیں" ۵؎

۱؎ ایضاً۔ص۔۵۹، ۲؎ ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس۔مرتب: مولانا محمد منظور نعمانی ص ۱۵،۱۶

۳؎ مجموعہ رسائل تصوف؛ بحوالہ تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی۔ مؤلف، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی۔ ص۔ ۵۰

۴؎ ایضاً۔ص۔ ۵۰، ۵؎ ایضاً۔ ص۔ ۵۳

ان دعاؤں کے متعلق فرمایا:

" مشائخ سے جو دعائیں منقول ہیں، ان میں وہ تاثیر نہیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعائیں فرمائی ہیں ان میں ہیں،، [1]

مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ان اقوال سے ظاہر ہے کہ متبعین شریعت ہی ولی کامل ہو سکتے ہیں، اور جو شخص ولی کامل ہوتا ہے اور دین و شریعت پر عمل کرتا ہے یقیناً اس کے ملفوظات بھی دین و شریعت کی عکاسی کرتے ہیں اور خالص اسلامی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں، زندگی کو سنوارنے اور بنانے کا صحیح راستہ بتاتے ہیں۔ وہ ملفوظات درد و محبت اور معرفت و یقین سے لبریز ہوتے ہیں، لیکن جب صاحبِ ملفوظات رسم و رواج اشراقیت، مشائیت، بدعت، یونانی فلسفہ اور غیر اسلامی مجاہدہ و ریاضت کا پابند ہو تو ان کے ملفوظات خالص اسلامی افکار کا ترجمان نہیں ہو سکتے، شخصیت میں جس درجہ اسلامی تصوّف سے انحراف ہوگا۔ اس درجہ کا انحراف اس کے ملفوظات میں بھی ہوگا۔ اس لئے اقوال و اعمال شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں لیکن ملفوظات کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ولی کامل جو متبع شریعت ہے، ان کے مریدوں نے بسا اوقات اصطلاحات و مقامات کی تعبیر و تشریح کرنے میں غلطی کی ہے اور عقیدت میں غلطی کی وجہ سے نہ جانے کیا کیا باتیں صاحب ملفوظات کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ ادب اسلامی اور فکرِ اسلامی کی رو سے ان باتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن جنھوں نے نامور اولیاء اللہ کے حالات اور ان کی تعلیمات پر مبنی کتاب "بزم صوفیہ" تصنیف کی ہے، خواجہ عثمان ہرونی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، فریدالدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، شیخ برہان الدین غریب، خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی، شرف الدین یحییٰ منیری، سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت، اور سید محمد گیسو دراز

---

[1] ایضاً۔ ص:۔ ۵۲

کی تصنیفات کے ساتھ ان کے ملفوظات کے مضامین پر بھی گفتگو کی ہے۔ ان کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان اولیاء کے ملفوظات کے مضامین کو بڑے احتیاط کے ساتھ نقل کیا ہے، اس کے باوجود ملفوظات میں غیر شرعی باتوں کی کثرت کی وجہ سے ان کا احتیاط مجروح ہوگیا ہے، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کتاب کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے۔

" احتیاط اپنے نزدیک اس کی کرلی کہ جو امور خلاف، شریعت یا بہت زیادہ مبالغہ نظر آئے، انھیں نظر انداز کر دیا۔ لیکن اتنی احتیاط ناکافی رہی، کتاب میں خال خال نہیں کثرت سے مقامات ایسے آگئے ہیں، جن سے ایک سیدھے سادے متبع شریعت مسلمان کو وحشت ہونا لازمی ہے، قصور مؤلف کا نہیں، اصل ماخذوں کا ہے۔ ؎

ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں" [1]

مزید تحریر کرتے ہیں:

" اول تو یہ حضرات صوفیہ واللہ اعلم کن کن احوال و مقامات سے گزرتے ہیں، ان کے سیر و سلوک کی بہت سی منزلیں ہیں، ہم عوام اور اہل ظاہر کے لیے ناقابل فہم، اس پر طرہ ان کی خاص خاص اصطلاحات اور رمز و کنائے، بولا کچھ گیا، اور مراد اس سے کچھ لی گئی، اور سب سے بڑھ کر خوش عقیدہ ملفوظ نویس حضرات کا عقیدت مندانہ غلو، کہیں خاص کو عام کر دیا، کہیں وجد و کیفیات کو شرائع و احکام کا درجہ دے دیا۔ غرض بات کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا" [2]

ملفوظات میں غموض، خوش عقیدگی کا اظہار، باطنی کیفیات کی غیر دینی تشریح مختلف فیہ فروعی مسائل میں غلو اور اصرار، بسا اوقات قرآنی آیات و احادیث کی غلط تشریح، رموز دین اور حجابات علم کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کثرت سے پائی جاتی ہے

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن - بزم صوفیہ - تقریب ص - ۲ [2] ایضاً۔

اس کے باوجود ملفوظات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ صوفیا جن کے پاس شریعت کا علم تھا۔ اور ان کے خوش عقیدہ ملفوظات نویس بھی علم شریعت سے آگاہ تھے۔ ان کے ملفوظات میں مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں، جن میں مؤمن صادق کی آواز معلوم ہوتی ہے مثلاً محبوب الٰہی کے تمام ملفوظات کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن تحریر کرتے ہیں :۔

" ان تمام ملفوظات میں ایک سالک کو توبہ، استقامت توبہ، ایمان، استغراق نماز، تلاوت قرآن اور اوراد وظائف، فقر و فاقہ، ترک دنیا، جہد و طاعت، مشغول حق، مجاہدہ، صبر و رضا، توکل، احترام پیر، حلم و بردباری، اور جود و سخا کی وہی تعلیمات دی گئی ہیں، جو چشتیہ سلسلہ کے پیشرو مشائخ نے دی تھی" [1]

ملفوظات میں اکثر و بیشتر ان ہی مضامین کا ذکر ملتا ہے اس لیے کہ ان ہی باتوں پر عمل کرکے انسان انسانیت کے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے، دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی حاصل ہوتی ہے، انسان راہِ راست پر چلتا ہے اس کا اثر فرد کی ذات میں ہونے کے ساتھ معاشرہ پر بھی اثر پڑتا ہے معاشرہ میں جب بھی خرابی پیدا ہوئی، عدم استحکام کی کیفیت آئی، لوگ ذہنی اور اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوگئے، اولیاء اللہ کی تعلیمات اور ملفوظات نے فرد و معاشرہ کی اصلاح میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا، محبوب الٰہی کے ملفوظات کے جن مضامین کا ذکر کیا گیا، بنیادی طور پر اولیاء اللہ کے ملفوظات کے انہی مضامین و افکار نے معاشرہ میں انقلاب برپا کر دیا، کوئی بھی تحریر یا ادبی گلدستہ ہو "فکر" کی بڑی اہمیت ہے، ادبی کلمات کی قدر و قیمت کا اصل معیار فکر و اسلوب میں ہے، اولیاء اللہ کے ملفوظات کے افکار نے فرد و معاشرہ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس لئے کہ ان کے پاکیزہ افکار کا سرچشمہ قرآن و سنت ہے، اولیاء اللہ کے الفاظ میں سوز دروں بھی شامل ہے، اور یہ بات مسلمہ ہے کہ

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ بزم صوفیہ۔ تقریب۔ ص ۔ ۲۶۸

ع ازدل خیزد بر دل ریزد ۔۔ بقول علامہ اقبال ع دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔
حقیقی ادب وہی ہے جو مؤثر بھی ہے اور انسان کو انسانیت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ ان ملفوظات میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، جن اولیاء اللہ کے ملفوظات میں اسلامی تعلیمات اور فکر اسلامی کی صحیح روح پائی جاتی ہے، اور عشق خدا و رسولؐ میں ان کا دل سرشار ہے، دل کی گہرائیوں سے بات کہتے ہیں تاکہ اس درد دل کا اثر دوسروں پر ہو، ابو عثمان خدری کا مقولہ ہے کہ "جو شخص سنت نبوی کو قولاً و فعلاً اپنے اوپر حاکم بنالے اس کی بات ہمیشہ حکمت سے لبریز نکلے گی،" [۱] اسی وجہ سے اولیاء اللہ کے کلام مؤثر ہوتے ہیں، اہل مجلس اور دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کے ملفوظات کی بڑی تعداد ہے، "الثقافة الإسلامية في الهند" مصنف مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب میں ۵۲ ملفوظات کا ذکر کیا ہے، اس میں انیسویں صدی کے اواخر تک کے ملفوظات کو شامل کیا گیا ہے، گرچہ وہ مکمل احاطہ نہیں ہے پھر بھی اہم ملفوظات شامل ہیں، بیسویں صدی کے صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے ملفوظات کو بھی اہل تعلق و مریدان باصفا نے ترتیب دی ہیں، اسلامی تعلیمات اور فکر اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہر ایک مجموعۂ ملفوظات کے مطالعہ اور جائزہ کی ضرورت ہے، اور صحیح فکر اسلامی کو نمایاں کرنے کی حاجت ہے تاکہ ادبی معیار متعین ہونے کے ساتھ ملفوظات کی نشاندہی ہو سکے۔

عام طور پر ملفوظات میں جن کی طرف یہ ملفوظات منسوب ہیں، الفاظ ان کے نہیں ہیں، انھوں نے جو کچھ فرمایا، ملفوظ نویس نے اپنے انداز اسلوب میں تحریر کر دیا۔ اور عین ممکن ہے کہ بعض باتوں کو اس طرح ضبط تحریر میں لائے ہوں جو صاحب ملفوظات کا منشا اور مقصد اظہار نہ ہوں، ملفوظات کے افکار و اسالیب میں ملفوظ نویسوں کے اثرات پائے جاتے ہیں، اس لئے ادبی معیار متعین کرنے کے لیے ملفوظ نویس کی شخصیت کا مطالعہ بھی

---

[۱] عبدالماجد دریا بادی ۔۔ تصوف اسلام ۔ ص۔ ۳۶

ضروری ہے، مختلف ملفوظات اور اس کے مرتب کرنے والوں کی شخصیت اور علم و فضل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، کہ مرتب کرنے والوں نے کس احتیاط اور کس عقیدت کے ساتھ ملفوظات کو نقل کیا ہے اور کس حد تک ملفوظ نویسوں کی فکر ملفوظات میں شامل ہو گئی ہیں، ملفوظات کے انتخاب اور ترتیب میں ملفوظ نویسوں اور مرتب کرنے والوں کا ذوق بھی شامل ہے، اس کے باوجود ملفوظات کی افادیت اور ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ پر ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے "ملفوظات خواجگان چشت[1]" کے متعلق تحریر کیا:

"ہندوستان کے دنیائے فقر و تصوف میں ایک خاص شہرت و امتیاز سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو حاصل ہے، ان خواجگان چشت کے "پنجتن پاک" نے اپنی تعلیمات و ہدایات اپنے ملفوظات کے قالب میں چھوڑی ہیں، مختلف مجلسوں میں جو کلمے ان کی زبان مبارک سے نکلتے تھے۔ مریدان باصفا انھیں قلمبند کر لیتے اور مرتب کر کے اپنی ملفوظات مبارک کو شائع کر دیتے۔ مرشدوں کے ان ارشادات کو جمع اور مرتب کرنے والے خود اپنی اپنی نوبت پر صاحب ارشاد اور بانیٔ سلسلہ ثابت ہوئے اور گو محدثین کی سی تاریخیت اور سند متصل کا التزام بزم تصوف کی چیز نہیں، پھر بھی اپنے حدود کے اندر شمع سے شمع اسی طرح روشن ہوتی رہی، اور پستیوں تک چراغ سے چراغ جلتا رہا۔" [2]

---

[1] ملفوظات خواجگان چشت: (۱) انیس الارواح ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی مرتب خواجہ معین الدین چشتی۔ (۲) دلیل العارفین ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی مرتب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ (۳) فوائد السالکین ملفوظات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، مرتب خواجہ فرید الدین گنج شکر، (۴) راحت القلوب ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر۔ مرتب خواجہ نظام الدین اولیا، (۵) اسرار الاولیا، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر مرتب بدر اسحٰق۔

[2] عبدالماجد دریابادی۔ تصوف اسلام۔ ص ۱۴۲

اولیاء اللہ کے ملفوظات ادبیات کا اہم حصہ ہیں جس نے ان سے استفادہ کیا اس نے اپنے اندر اخلاق حسنہ اور اعمال حسنہ پیدا کیا، اس کی زندگی میں نئی روح آگئی، وہ عشق الٰہی میں سرشار ہوگیا۔ اور جو عشق الٰہی میں ڈوب گیا اس نے زندگی اور انسانیت کے اعلیٰ مرتبہ کو پالیا۔ علامہ اقبال نے اپنے مکتوب بنام نیاز الدین خاں میں تحریر کیا:

"تصوف کے ادبیات کا حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابل قدر ہے، کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے، فلسفہ کا حصہ محض بیکار ہے"۔ [1]

ملفوظات میں عام طور سے فلسفیانہ مباحث کم ہیں بہ نسبت تصنیفات کے، اس لئے انسان کی کردار سازی کے لیے ملفوظات مفید ہیں، تصوف کے فلسفیانہ مباحث خود تصوف کو بے روح اور بے جان بنا دیتے ہیں، اور تصوف اپنے مقاصد سے بہت دور جا پڑتا ہے اس لئے فلسفہ جو ملفوظات میں شامل ہوگیا ہے، ادبی نکات میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے فلسفیانہ شگافی تو کی جاسکتی ہے لیکن اس سے زندگی کو سنوارنے کا کام نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے جذبۂ عشق پیدا ہوسکتا ہے،

ادب میں تصوف کا موضوع نیا نہیں ہے، تصوف کے رموز و اسرار اور مسائل تصوف پر ادبا اور ناقدوں نے کثرت سے لکھا ہے، خاص طور سے شاعری میں تصوف کے رموز و نکات خوب خوب بیان کئے گئے ہیں۔ وہ شعراء جنھوں نے ذوق سخن کی آبیاری یا تو تصوف سے کی یا زندگی کے کسی مرحلہ میں اس کی لذت سے آشنا ہوگئے وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ (جیسے ولی، مرزا مظہر جان جاناں، میر درد، آتش، نیاز بریلوی، آسی غازیپوری حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی) مشرق و مغرب کے شعراء نے عشق حقیقی، زہد و تقویٰ انابت الی اللہ، تقرب باللہ، وحدت الوجود، وحدت الشہود، نفس و خواہشات، فقر و درویشی، غنا، بے ثباتی عالم، اعمال انسانی، مذہبی رواداری، اور فلسفۂ تصوف کے دوسرے موضوع

---

[1] مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین ص ۱-۲

کو خوب خوب اپنی شاعری میں برتنے کی کوشش کی لیکن اہلِ دل جو احکامِ شریعت کے پابند تھے، عشقِ الٰہی اور حبِ رسولؐ میں اپنے کو فنا کر چکے تھے، شعراء ان اہلِ دل کا سوز دروں، قوتِ تاثیر، فکرِ آخرت، جذبۂ انسانیت، روحانی قوت، اور غمخواری کی بات کہاں سے لاتے؟ اولیاء اللہ کے کردار اور ملفوظات کی ہمسری شعراء کہاں کر سکتے تھے، اسی لئے تو غالب نے کہا ؎

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتے

دلچسپ بات یہ ہے کہ میخوار یا اس دنیا کے غمخوار شعراء (خاص طور سے رومانوی شعراء) نے تصوف کی جو باتیں کی ہیں وہ تو شعر و ادب اور تنقید کے میدان میں قابلِ توجہ سمجھی گئیں، ان کی تنقید و تجزیہ کرنے میں خوب موشگافیاں کی گئیں، لیکن جو اہلِ تصوف ولی اور عابد و زاہد تھے، اور جو سراپا تصوف تھے، ان کے کلام، ان کی گفتگو، ان کے وجدان و احساس، جمالیاتی ذوق، پاکیزہ افکار و خیالات کی نیرنگی، اور اسلوب کی اعنائی کو نظر انداز کر دیا گیا، ادب کے مسند بران کو جگہ نہیں دی گئی، یہ میخواروں، بادہ خواروں اور اہلِ دنیائے ہوس کی طرف سے ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے،

ملفوظات کو جب ادب کے دائرہ میں شامل کرتے ہیں تو ان کا ادبی تنقیدی جائزہ ضروری ہے، تنقیدی جائزہ سے فکری رجحان کا پتہ چلتا ہے، مختلف موضوعات کا فرق معلوم ہوتا ہے، اس سے فلسفہ، ادب، اور دوسرے موضوعات میں تفریق کی جا سکتی ہے، صالح اور غیر صالح عناصر کی نشاندہی ہو سکتی ہے، اور مختلف اندازِ فکر کا بخوبی علم ہو سکتا ہے، اس لئے ملفوظات کو جب ادب کے آئینہ میں پیش کیا جائے گا تو اس کے افکار اور مضامین کے ساتھ زبان و اسالیب کا تجزیہ لازمی ہے، تنقید میں اصلاح کی نیت ہو تو وہ تنقید تعمیری ہوتی ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات، پر ایک شخص نے تنقید کی تو آپ نے قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا: "اگر کسی کی تنقید قابلِ قبول

ہو تو ضرور قبول کرنا چاہیے،،[1] اور اپنی ذات کے متعلق انھوں نے ارشاد فرمایا" میرے اقوال و اعمال قابل احتجاج نہیں، جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے، البتہ تحریر قابل اعتماد ہے اس لئے کہ مولویوں اور مفتیوں کو بار بار دکھا لیتا ہوں"۔[2] مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ صحبتے اولیاء کا مطالعہ کریں تو ملفوظات قرآن و احادیث کے عکس نظر آتے ہیں اور ان میں زندگی کے مختلف مراحل اور مواقع کی تربیت کا سامان ملتا ہے، زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لئے نہایت قابل قدر تعلیمات دی گئی ہیں لیکن ولی کامل کا احتیاط یہ ہے کہ انھوں نے خود فرمایا: یہ میرے اقوال و اعمال قابل احتجاج نہیں، جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن و سنّت کی روشنی میں ملفوظات کا تجزیہ کرنا چاہیئے، ادبی تنقید کا یہ بنیادی کام ہے،

ملفوظات کا ادبی حیثیت سے مطالعہ کرنا اور ملفوظات کا ادبی و فنی قدر و قیمت معلوم کرنا گویا کہ موجودہ نئی نسل کے لئے ماضی کی خوبیوں کی تلاش و جستجو کرنا ہے، اور اس کے ذریعہ نئی تعبیر و تشریح اور فنی صلاحیت کو اجاگر کرنا ہے، اگر ہم ملفوظات کو فرسودہ و دفینہ سمجھ کر چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ذات و شخصیت سے وابستہ فکر و ادب کی عمارت کو منہدم کر رہے ہیں اور اپنے ذہن و دماغ سے نئی توانائی کے ساتھ جو پودا پیدا ہوگا اس کی خمیر جس زمین سے تیار ہوگی۔ اس زمین کو وجود سے عدم کی طرف منتقل کر رہے ہیں تنقید کا کام صرف خاص قسم کے ادب تک محدود رکھنا معاشرہ اور اجتماعی زندگی میں جمود پیدا کرنا ہے،

جس قسم کے ادب کو مغربی تنقید نے جنم دیا ہے اور اس کے اثر سے مشرقی ادبیات کا وجود ہوا ہے۔ ادب اور فنی ادب کے نام پر زندگی کا دائرہ تنگ ہو گیا ہے، زندگی اور فن کا تصور محدود ہو گیا ہے، ایسے ادب کو بیمار ذہن کی تعبیر اور اس کی تقلید کہہ سکتے ہیں جس

---

[1] صحبتے با اولیاء ملفوظات حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا۔ مرتب مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔ ص۔ ۹۰، ۹۱ء [2] ایضاً۔ ص۔ ۱۲۲

جس ادب کو اہل مغرب اور اس کے مقلدین کے نزدیک فنی اختراع، نئی جہتوں کی تلاش اور آزادیٔ فکر کا نتیجہ کچھ سمجھا جاتا ہے، درحقیقت زندگی کے حقیر جذبات اور افکار کی عکاسی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگرچہ فنی ادب کو زندگی کے مختلف گوشوں کا ترجمان اور عکس کہا جاتا ہے، اس کی تعبیر و تشریح کی جاتی ہے لیکن مواد پر غور کریں تو بغیر کسی پس و پیش کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے سفلی جذبات کے اردگرد پورا ادب گھومتا نظر آتا ہے، خواہ اس کو ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، کلاسکی، رومانوی، مارکسی، ترقی پسندی، جدیدیت، اشاریت، سریالیت، جو کچھ بھی کہہ لیں، اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جس کو ادب کہا جاتا ہے پورا ادب سفلی جذبات کا ترجمان ہے، بلکہ ادب کا وہ نقطہ جو حقیر جذبات کے اظہار اور اس کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے اور انسانیت کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور اسی حصہ کو جو ادب تصور کرتا ہے اس کے نزدیک زندگی کا تصور محدود ہے اور اس کا تصور انسانیت کے اعلا اقدار کی فکر سے خالی ہے۔

ادب کے اس مخصوص اور محدود ماحول اور دائرہ سے نکال کر پوری زندگی پر پھیلایا جائے۔ اس کا بھرپور مطالعہ کیا جائے اس کی تحلیل کی جائے، تنقید کو چند مخصوص اصطلاحات اور مخصوص رجحانات سے الگ کر کے زندگی کے دوسرے وہ تمام پہلو جس کو ابھی تک ادب سے خارج رکھا گیا ہے۔ ان پر تنقید کا دائرہ وسیع کیا جائے تو فکر و احساس کی بنیاد صحیح قسم کی زندگی میں تلاش کی جا سکتی ہے اور وہ زندگی معاشرہ و سماج کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نئی تبدیلی لانے کا سبب بن سکتی ہے۔

ملفوظات کا مطالعہ فنی و ادبی حیثیت سے کیا جائے اس میں صحیح زندگی کی فکر اور احساس تلاش کی جائے تو زندگی کو ایک نئی توانائی، نئی حرارت، نئی فکر اور نیا احساس مل سکتا ہے، اور حقیقی زندگی کا ایک صحیح تصور سامنے آسکتا ہے، انسانی معاشرہ و سماج میں ایک نئی روح پھونک سکتا ہے۔ دنیا جو عالم اضطراب میں ہے اس کو سکون و طمانیت مل سکتی ہے، اس لئے کہ صوفیا، انسانی نفسیات کے بڑے معالج ہوتے ہیں۔

صوفیاء نے فرد و معاشرہ کے نبض پر ہمیشہ ہاتھ رکھا ہے، ملفوظات اور زبان و ادب کے ذریعہ ہمیشہ معاشرہ کی اصلاح کی ہے ۔ زبان و ادب کی ترقی میں غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "اردو کے ابتدائی نشوو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں تحریر کرتے ہیں :۔

" وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے؛ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اور اس پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہنچتا ہے، جہاں کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں۔ جن سے ہم خود اکثر واقف نہیں ہوتے "۔ ؎۱

یہ کہا جاتا ہے کہ اولیا اللہ نے ملفوظات میں دنیا سے بے رغبتی کی تعلیم دی ہے اس دنیا کی زندگی کو خیر باد کہہ کر محض مجاہدہ و ریاضت اور عبادت کا درس دیا ہے، اس میں زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ واقعہ ہے کہ حقیقی زندگی کا تصور اولیاء اللہ نے اپنے ملفوظات میں دیا ہے ۔انسان کو انسان بنانے کی تعلیم ہی زندگی کا عکس آئینہ ہے، ملفوظات میں انسان کی داخلی آرزومندی کے بارآور ہونے کا سامان مہیا کیا گیا ہے ،روحانی واخلاقی میراث کو از سرِ نو ترتیب دے کر مستحکم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے ملفوظات میں ترک دنیا کی جو تعلیم دی گئی ہے ، محبوب الٰہی کے ملفوظات "فوائد الفواد" میں اس کا مطلب یہ ہے۔

" ترک دنیا کے معنی یہ ہیں کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے ۔ البتہ جو کماتا رہے خرچ کرتا رہے، جوڑ جوڑ کر نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھے یہ ترک دنیا ہے"۔ ؎۲

؎۱ عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما ہی کا صوفیائے کرام کا حصہ (مطبوعہ ۱۹۳۳ء مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن) ص ۔ ۳

؎۲ عبدالماجد دریابادی ۔ تصوف اسلام ۔ ص ۔ ۱۵۰

اولیاء اللہ کے ملفوظات کا زندگی اور ادب سے گہرا تعلق ہے، چونکہ ادب زندگی کا اظہار ہے اور ملفوظات میں زندگی کا اظہار۔ اس لئے ملفوظات ادب کا حصہ ہیں کسی بھی معاشرہ اور دور کے حالات کا بخوبی جائزہ لینا ہو تو ملفوظات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اولیاء اللہ اپنی عملی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے ساتھ معاشرہ کے بگاڑ، خرابی، اخلاقی زبوں حالی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت، اور برائیوں میں مبتلا ہونے کے مرض سے لوگوں کو متنبہ بھی کرتے ہیں اور اپنے ان افکار و خیالات جن کا سرچشمہ قرآن و سنت اور متبعین شریعت کے اقوال و اعمال سے وابستہ ہوتا ہے کے ذریعہ معاشرہ میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ اولیاء اللہ صاحب بصیرت ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے زوال پذیر ہونے کا احساس ان کو چین سے نہیں رہنے دیتا ہے۔ اس لئے اپنی تحریروں و تقریروں کے علاوہ اٹھتے بیٹھتے، ان کے ساتھ جو بھی ہوتے ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں، معاشرہ اور لوگوں کو تباہی سے بچانے اور فکر آخرت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنے الفاظ و کلمات سے نوازتے رہتے ہیں۔ شب و روز کے یہی الفاظ و کلمات جو دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں اور مخلوق کو متاثر کرتے ہیں۔ جب کوئی مخلص بندہ ان الفاظ کو یکجا کر دیتا ہے تو ملفوظات کے مجموعہ کی شکل میں سامنے نظر آتے ہیں۔ اس میں موضوع و مضامین کا تنوع ہوتا ہے۔ ان ملفوظات کا بنیادی محور قرب مع اللہ اور انابت الی اللہ کی تعلیم و تلقین، فکر آخرت اور حقیقی زندگی کی تلاش کی دعوت ہوتی ہے لیکن معاشرہ میں انسان کے شب و روز میں مختلف مسائل پیش آتے ہیں۔ ارتکاب گناہ کے مختلف اسباب ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ رضاء الٰہی اور عبادت الٰہی، حصول ثواب اور نیک اعمال کے مختلف پہلو ہیں۔ اس لئے ملفوظات میں موضوع اور مضامین کی کثرت ہوتی ہے [1]

---

[1] مجدد الف ثانی اور دوسروں کے ملفوظات میں یہ باتیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "تزکیہ احسان" اور ان کی تصنیفات تاریخ دعوت و عزیمت اور دوسری کتابوں میں تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔

ایک صالح اور زندہ معاشرہ کی بقاء اور دین کے حقیقی روح کے وجود کے لیے لئے سلف صالحین کے ملفوظات کا مطالعہ ادبی حیثیت سے ضروری ہے۔ بقول جمیل جالبی: "ادب ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک معاشرہ اپنی حقیقی روح دریافت کرتا ہے"[1]

ہم نیا شعور، نئی آگہی ملفوظات سے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے صحیح سمت کی یقین اور زندگی کے حقائق کی دریافت اولیاء اللہ کے اقوال کے ذریعہ کر سکتے ہیں زندگی کی تلاش ہی ادب کا بنیادی مقصد ہے، جو ادب اس مقصد کے حصول میں معاون ہو وہی زندہ ادب ہے۔ اس ادب کا زندگی اور معاشرہ سے بنیادی رشتہ ہوتا ہے۔ اور اسی ادب کے مطالعہ سے فرد اور معاشرہ میں نیا شعور پیدا ہوتا ہے، اور معاشرہ میں زندگی کی علامت محسوس کی جاتی ہے، اس سے معاشرہ زندہ رہتا ہے اور ملفوظات کا ادب بھی زندہ رہتا ہے۔

ادب میں اس بات کا اظہار ہوتا ہے اور ان باتوں کی خواہش اور آرزو کا ذکر ہوتا ہے جن کو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے، اولیاء اللہ کی گفتگو میں رضاء الٰہی کے اعلیٰ درجہ کے حصول کی تلقین ہوتی ہے، اور اس بات کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے کہ انسان نفسیاتی خواہشات اور پست جذبات کو ترک کر کے ایسی خواہشات کی تکمیل کا آرزومند ہو جائے جو انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دے، اور اس آرزو کی تکمیل کے لئے ہمیشہ طلب و جستجو جاری رکھے، اولیاء اللہ کے ملفوظات میں چونکہ ان نیک خواہشات کی آرزو کا اظہار ہوتا ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے وہ بھی ادب کا حصہ ہیں اور زندہ ادب ہیں۔

حیات و کائنات پر تو صرف اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے، لیکن ملفوظات میں جن باتوں کی عام طور پر تعلیم دی گئی ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مومن صادق میں انابت الی اللہ کا

---

[1] جمیل جالبی: ادب کلچر اور مسائل۔ ص۔ ۱۳۔

شوق اس درجہ ہو کہ ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ اسے ہم وحدت الوجود کا نام دیں یا وحدت الشہود کا یا کچھ اور، اس بلند مرتبہ پر پہنچے اور اس کے بعد ایسی مسرت حاصل ہو کہ حیات انسانی اس کو تصرف کائنات سمجھنے لگے۔ اس میں تخیل ضرور شامل ہے۔ لیکن اس اس تخیل سے عمل اور حقائق کا رشتہ قائم ہے، اس میں حقیقی مسرت کے ساتھ انسان کی ذہنی بلندی آشکار ہوتی ہے، مسرت و شادمانی، نیک خواہشات کا ایسا بھرپور احساس اس میں شامل ہوتا ہے اور انسان ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں سطحی ادب یا سائنس انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش میں اپنی ذات کو ضرور دریافت کر لیتا ہے اور یہ ایسی دریافت ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا کی کوئی دریافت نہیں ہے،

ملفوظات میں انسانی حالت و کیفیت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ اور ملفوظات سے احساسات کے تنوع کا علم بھی ہوتا ہے۔

ذات کا عرفان ہر دور میں ضروری رہا ہے، اس دور میں بھی "ذات کا عرفان" ضروری ہے، اور اس دور کے ادب کا بنیادی کام "ذات کا عرفان" ہے، ملفوظات کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ آنے والی نسل کو "ذات کے عرفان" کی تعلیم دی جائے اور ملفوظات نے یہ کام بخوبی کیا۔ اس لئے ادبی حیثیت سے ملفوظات کا یہ ایک اہم پہلو ہے،

ملفوظات میں جذبہ و فکر شامل ہوتے ہیں، اولیاء اللہ کے الفاظ و کلمات جو منھ سے نکلتے ہیں وہ ان کے جذبہ و فکر کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ملفوظات میں تجربات بھی پائے جاتے ہیں، ملفوظات میں جن تجربات کا ذکر ہوتا ہے اس کے مطالعہ سے فرد و معاشرہ کے شعور اور تجربات میں اضافہ ہوتا ہے اولیاء اللہ جب اپنے یا دوسرے متبعین شریعت کے تجربے کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن میں آفاقی اقدار شامل ہوتے ہیں اور ان کے تجربے سے نئے تجربے کا ادراک ہوتا ہے اور اس طرح گویا دوسرے بھی ان تجربے سے گذرتے ہیں، جب اولیاء اللہ کی زندگی کے تجربے سے کچھ حاصل کیا جائے تو اس میں زندگی کے لئے ایسی روشنی ملے گی، جو تابناک ہوگی،

علم وفن کے خزانہ کے علاوہ زندگی کے سامنے ایسی مثبت راہ ہوگی جس پر چل کر اس دنیا کی کامیابی کے ساتھ آخرت کی کامیابی، شادمانی، سرخروئی اور باغ و بہار زندگی کی طمانیت حاصل ہوگی۔

اس دور میں جب کہ انسان خلاؤں میں کھو گیا ہے، اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے، ادب کے نام پر ایسے ادب کو وجود میں لایا گیا ہے جس کے مطالعہ نے انسان کو ایسی زندگی گذارنے کا راستہ دکھایا ہے جہاں تعیش ہی تعیش ہے، حقیر جذبات کا اظہار اس کی تسکین زندگی کا مقصد بن گیا ہے، معیار زندگی بلند کرنے کے تگ و دو میں انسان نے اپنی حقیقت بھلانے کے ساتھ بے مقصد حیوانی زندگی کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، اس لئے ایسے ادب کا مطالعہ ضروری ہے جس سے انسان سمجھ سکے کہ بالآخر انسان کی حقیقت کیا ہے؟ دنیا میں اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ اور دنیا میں کس طریقہ پر زندگی گذارے؟ اس کے لئے ادب اسلامی کے دوسرے اصناف کے ساتھ ملفوظات کا مطالعہ ادبی حیثیت سے بھی نہایت ضروری ہے تاکہ انسان اپنے گم شدہ راہ سے نکل کر صراطِ مستقیم پر آسکے، اس کے لئے شرط ہے کہ پارٹی لائن (تصوف کے مختلف سلسلے) سے بالاتر ہو کر حقائق کو سمجھا جائے اور عمل کیا جائے، ــــ ملفوظات گراں بہا گنجینۂ علم و عرفان ہیں، عرفان ذات اور آگہی اس دبستانِ علم و عرفان سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

حضرت تھانویؒ کے مواعظ کا ادبی مطالعہ

مواعظ جمع ہے موعظت کی، اور موعظت یا وعظ ہم معنی ہے پند و نصیحت کے۔ عرف میں اس سے مراد وہ تقریریں ہوتی ہیں، جن کا محرک جذبۂ دینی ہو اور جن کا مقصود مادیت کے بجائے روحانیت اور دنیا کے بجائے دین کا ذوق پیدا کرنا ہو۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نہایت عظیم المرتبت عالم دین، مفسر، محدث اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ واعظ بھی تھے۔ بلاشبہ آپ نے ہزاروں کی تعداد وعظ کہے، جن میں ساڑھے تین سو کے قریب قلم بند ہو کر محفوظ بھی ہوئے اور بلامبالغہ ہزارہا ہزار کی تعداد میں سامعین انھیں سن کر ہدایت یاب و راہ یاب ہوئے۔ ان سے فیض یابی کا سلسلہ صدقۂ جاریہ کی طرح برابر جاری ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ بھی باقی رہے گا۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب مواعظ ادبی محرکات کے تحت وجود میں نہیں آتے اور ان کے سننے یا پڑھنے والوں کے مدنظر بھی ادبی ذوق کی تسکین نہیں ہوتی، تو پھر مواعظ کا ادبی نقطۂ نظر سے مطالعہ چہ معنی دارد؟ اور کیا یہ مواعظ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے کہ انھیں رشد و ہدایت کی مجالس سے نکال کر شعر و ادب کی بزم میں لایا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نہ تو مواعظ کی قلب ماہیت کرنا چاہتے اور نہ ادب کی حدود و قیود کو توڑنا چاہتے۔ ہم تو صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ادب سکّہ بند تحریروں میں محدود نہیں۔ ادب کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے، جتنا خود زبان کا۔ اب اگر آپ اپنے ذہن و دماغ کے

دریچوں کو وا رکھیں تو ادب کی فرحت بخش ہوائیں ہر طرف سے آسکتی ہیں۔ ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم بعض موضوعات کے ساتھ تعصب و تحزب کا معاملہ کرتے ہوئے انھیں پہلے ہی خارج از دائرۂ ادب قرار دیتے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں ادبی نقطۂ نظر سے ان کے مطالعے کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوتی کچھ ایسی صورت حال مواعظ و ملفوظات کی بھی ہے۔ ہم نے پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا کہ بزرگانِ دین کی تقریروں اور ملفوظات میں ادب کہاں؟ اس لیے ہم ان کے ادبی گوشوں اور پہلوؤں سے بھی بے خبر رہ گئے۔ یہاں لگے ہاتھوں اس بات کی وضاحت بھی مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ملفوظات کا ادب شاعری، داستان، انشائیے اور تخلیقی نثر وغیرہ سے مختلف ہے۔ بہ ایں معنیٰ کہ ادب کی مسلّمہ شعری و نثری اصناف میں مقصود بالذات ادب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مواعظ و ملفوظات وغیرہ میں مقصود بالذات انکا موضوع ہوتا ہے اور ان کی ادبی حیثیت ضمنی و اضافی ہوتی ہے۔

اس عمومی گفتگو کے بعد ہم اپنے خصوصی موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ عام مواعظ کی طرح حضرت تھانوی کے مواعظ بھی نثر میں ہیں۔ اچھی نثر کی بنیادی صفت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں وضاحت، اور استدلال کی شان پائی جائے۔ حضرت موصوف کی تحریروں کی طرح، ان کی تقریریں بھی نثر کی اس بنیادی صفت سے مزین ہیں۔ چنانچہ آپ کے مواعظ مراد میں نہایت واضح، مفہوم میں بالکل قطعی اور استدلال سے بھرپور ہوتے ہیں۔ حضرت کا عام طرز یہ ہے کہ پہلے ایک عمومی اور کلی بات بتاتے ہیں، پھر اس سے متعلق ایرادات و اشکالات کا ازالہ کرتے ہوئے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ درمیان میں ہر دعوے کو نقلی و عقلی دلائل سے مؤید بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح پوری بات منقح اور مہذب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص مسلسل، مربوط اور پر از استدلال تحریر و تقریر کا فن حاصل کرنا چاہے تو اُسے حضرت کے مواعظ کا مطالعہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھنا چاہیئے۔ اس دعوے کو دلائل سے مؤید کرنے کے لیے ہم حضرت کے ایک وعظ مسمّٰی بہ "روح الصیام" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"مجھے روح الصوم ہی کا آج بیان کرنا ہے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر شئے کی ایک صورت ہے ایک روح۔ اسی طرح صوم کی ایک روح ہے ایک صورت۔ یہاں پر ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ ہم روزہ رکھ کر کیا کریں گے، فقط اس کی روح کو جو مجاہدہ ہے حاصل کر لیں گے۔ بات یہ ہے کہ ہر عمل کی ایک صورت ہے ایک روح ہے۔ مثلاً نماز کہ اس کی ایک صورت ہے اور خشوع وخضوع وحضور قلب اس کی روح ہے۔ اسی طرح روزے کی ایک صورت ہے، ایک روح ہے۔ اور ان ارواح میں عقلی احتمال دو ہیں کہ ان کے خواص کے تحقق کے لیے صور خاصہ شرط ہیں یا نہیں ہیں۔ مگر ہم کو نصوص سے جن میں ان عبادات خاصہ کی فرضیت کا امر ہے، معلوم ہو گیا کہ صور خاصہ شرط ہیں۔ اور جہلائے صوفیا کو یہی دھوکا ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ اعمال کی روح کیلئے صور خاصہ شرط نہیں اور انھیں غیر مقصود سمجھ کر چھوڑ بیٹھے۔"

اور اسی وعظ میں آگے فرماتے ہیں:

"روزے کا مقصود روح مجاہدہ ہے کہ جس کا مصداق اعظم ترک معاصی ہے۔ اسی کو حضور فرماتے ہیں کہ جس نے روزہ میں جھوٹ نہ چھوڑا۔ بری اور بے ہودہ باتیں نہ چھوڑیں، خدا کو اس کے روزے کی کچھ حاجت نہیں۔ یوں تو خدا کو کسی کے بھی روزے کی کچھ حاجت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ روزے کا جو مقصود تھا ترک معاصی جب وہ اس سے نہ ہوا تو پھر روزہ کس کام کا ہوا؟"

اسی وعظ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

حقیقت میں مجاہدۂ نفس جہادِ اکبر ہے اور مجاہدۂ اہلِ نفس جہادِ اصغر۔ کیونکہ نفس کو معاصی سے روکنا اور اس میں اس کی مخالفت کرنا ذرا سخت کام ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ نفس کی مخالفت کے تین درجے ہیں۔ مخالفت فی المعاصی، مخالفت فی الحظوظ، مخالفت فی الحقوق۔ معاصی میں مخالفت تو فرض و واجب ہے اور مخالفت فی الحقوق معصیت ہے۔ البتہ مخالفت فی الحظوظ میں تفصیل ہے۔

بالکل چھوڑ دینا تو مذموم ہے، البتہ تقلیل اولیٰ ہے۔ کیونکہ بالکل چھوڑ دینے میں تنگ اور دق ہو کر تمام کا چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ پس نہ اسے بہت دق کرو، نہ بالکل توسیع کرو۔ اوسط کی چال رکھو۔ اور بالکلیہ حظوظ کے نہ چھوڑنے میں ایک دوسرا راز بھی ہے کہ اس سے خدا سے محبت ہو جاتی ہے۔ دیکھو اگر گرم پانی پیو گے تو مری ہوئی زبان سے الحمد للہ نکلے گا۔ ہمارے حضرت (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) فرمایا کرتے تھے کہ یہی راز ہے کہ سفر حج میں زاد راہ لے جانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ نفس تنگ نہ ہو۔ حضرت مولانا گنگوہی کو اسی وجہ سے ٹھنڈے پانی کا بڑا بڑا اہتمام تھا۔"

اقتباسات میں آپ نے دیکھا کہ مراد کس قدر واضح اور قطعی، بیان کس قدر مسلسل اور مربوط اور دعوے کس طرح دلائل سے مؤکد و مؤید ہیں۔ دور حاضر کے نامور اردو نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون "غبار کارواں" میں لکھا ہے کہ مجھے بچپن میں حضرت تھانوی کے مواعظ بکثرت پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں ان کے اسلوب سے متاثر بھی ہوا۔ فاروقی صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"میرے والد صاحب اقبالؔ اور مولانا تھانوی کی تحریروں کے شیدا تھے۔ سب سے پہلی کتابیں جو مجھے اپنے گھر میں نظر آئیں، وہ مولانا تھانویؒ کے مواعظ، ان کا بہشتی زیور اور اقبالؔ کا کلام تھا۔ ... مولانا تھانوی کے مواعظ کی شگفتگی، ان کا انتہائی واضح اور دل نشیں اسلوب اور جگہ جگہ اشعار کی برجستگی مجھے بہت اچھی لگی۔ میرا خیال ہے کہ میں نثر میں وضاحت اور استدلال پر جو اس قدر زور دیتا ہوں، تو اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ میں بچپن میں مولانا تھانوی کے اسلوب سے اثر پذیر ہوا ہوں۔"[1]

ادبی نقطۂ نظر سے حضرت تھانویؒ کے مواعظ کا یہ پہلو بھی نہایت اہم اور قابل ذکر

---

[1] غبار کارواں، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر، اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱

ہے کہ اس سے شعر فہمی و سخن سنجی کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت اپنے سلسلۂ بیان کے دوران آیاتِ قرآنیہ، احادیث و آثار اور حکایات و تمثیلات کے پہلو بہ پہلو کثرت کے ساتھ اشعار بھی پیش فرماتے رہتے ہیں۔ پھر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت کو شعرا میں سب سے زیادہ مناسبت مولانا روم سے رہی ہے۔ لہٰذا استشہاد و تمثیل کے موقع پر موصوف سب سے زیادہ مثنوی مولانا روم کے اشعار سناتے ہیں اور پھر نہایت دل نشیں پیرائے میں ان کی تشریح و توضیح بھی کرتے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ حضرت کا خاص میدان بھی تھا۔ چنانچہ اہلِ علم واقف ہیں کہ موصوف نے "کلیدِ مثنوی" کے نام سے دس بارہ جلدوں میں مثنوی مولانا روم کی نہایت بلند پایہ شرح بھی تصنیف فرمائی ہے۔ اس لیے حضرت کے مواعظ کے مطالعے سے ایک تو مولانا روم کی شخصیت و افکار سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے مثنوی کے مطالعے کا شوق نیز اس کے فہم کا ذوق نشو و نما پانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس ذوق و شوق کی آبیاری کی جائے تو اس کے برگ و بار لانے کے امکانات بھی قوی ہو سکتے ہیں۔ اب اس سلسلے کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت نے اپنے ایک وعظ میں اولاً ان لوگوں کی بے صبری پر نکیر فرمائی ہے، جو ذکر و شغل شروع کرتے ہی ثمرات کے متوقع ہو جاتے ہیں اور متنبہ فرمایا ہے کہ تعلیم ظاہری کی طرح تعلیم باطنی کی تکمیل بھی بہ تدریج ہوتی ہے۔ پھر اس بے صبری کی وجہ یہ بتائی ہے کہ در اصل یہ لوگ ذکر و شغل کی اہمیت سے واقف نہیں۔ ذکر درحقیقت محبوب حقیقی کی مجالست ہے اور محبوب حقیقی کی مجالست کے بارے میں مولانا روم کے یہ اشعار پیش فرماتے ہیں:

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　فوقِ گردون است نے قعرِ زمیں
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　جنت است آں، گرچہ باشد قعرِ چاہ

(محبوب جہاں کہیں بھی ہو، وہاں خوش خوش بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ جہاں محبوب ہو، اگرچہ وہ قعرِ زمین ہو، درحقیقت بمنزلۂ عرش ہے۔ حضرت یوسفؑ جیسا ماہِ تاباں جہاں کہیں موجود ہو، وہ جگہ کنوئیں کی گہرائی کیوں نہ ہو، جنت ہے۔)

گفت معشوقے بہ عاشق کاے فتیٰ تو بہ غربت دیدۂ بس شہرہا
بس کدامی شہر از آنہا خوشتر است گفت آں شہرے کہ دردے دلبر است

(کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کون سا شہر پسند کیا ہے؟ پس وہ کہتا ہے کہ سب سے عمدہ شہر وہ ہے، جہاں محبوب رہتا ہو۔)

اس کے بعد سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید ایک نکتہ یہ بیان فرمایا کہ عشاق کا تو یہ حال رہا ہے کہ اگر مسمّیٰ کی مجالست نصیب نہیں ہو سکی تو انہوں نے اسم ہی کی مجالست کو کافی سمجھا ہے۔ اس باب میں بھی مولانا روم کے ہی ان اشعار سے استشہاد فرمایا ہے:

دید مجنوں را یکے صحرا نورد در بیابانِ غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشقِ نام لیلیٰ می کنم خاطرِ خود را تسلّی می دہم

(کسی نے مجنوں کو صحرا میں تنہا دیکھا کہ ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے، پوچھا اے مجنوں! کسے خط لکھ رہا ہے؟ کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں۔)

اس پوری گفتگو کے بعد نتیجے کے طور پر بے صبر ذاکرین و شاغلین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ تو وہ لوگ ہیں جنھیں مسمّیٰ کی مجالست میسر نہیں۔ فقط اسم کی مجالست پر قناعت کرتے ہیں۔ اور تم ہو کہ تمہیں مسمّیٰ کی مجالست پر بھی قناعت نہیں۔ میں تمہیں خوش خبری دیتا ہوں کہ تم ذکر برابر کرتے رہو۔ یہی تمہاری آنکھوں کا نسخہ ہے۔ یہی نسخہ تمہیں ایک دن قلب کا بینا بنا دے گا۔"

پیر رومی کی رہنمائی کی ایک اور مثال مواعظِ اشرفی سے ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ ہم پر بھی وسوسہ غالب ہوا کہ کیا بات ہے کہ مقصود جلدی سے حاصل نہیں ہو جاتا؟ خدا کو ہماری طلب کا علم بھی ہے۔ ہم پر رحمت بھی ہے ہم کو مقصود تک پہنچا دینے کی قدرت بھی ہے۔ باوجود ان دوائی کے پھر کیوں دیر لگتی ہے۔

اسی پریشانی میں مثنوی شریف کھول کر جو دیکھی تو سرِ صفحہ پر یہ شعر نکلے۔ یہ بھی نہیں کہ دو چار ورق الٹنے پڑے ہوں:

چارہ می جوید پےِ دردِ تو، می شنودم دوش آہِ سرد تو،

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار رہ نمایم، داد ہم راہ گذار

تا ازیں طوفانِ دوراں وارہی بر سرِ گنجِ وصالم پا نہی

لیک شیرینی و لذاتِ مقر ہست بر اندازہ رنجِ سفر

آں گہ از فرزند و خویشاں برخوری کز غریبی رنج و محنت ہا بری

(تمہارا دردِ فراق ہمارے وصال کے لیے حیلہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ہم نے گذشتہ شب تمہاری آہِ سرد سن لی ہے۔ ہمیں اس پر بھی قدرت حاصل ہے کہ بلا کسی انتظار کے راستہ دکھلادیں اور خود تک رسائی کا موقع بھی عنایت کریں۔ تاکہ تم حوادثِ زمانہ کے اس طوفان سے نجات پاجاؤ اور ہمارے خزانہ و مال سے بہرہ ور ہوسکو۔ لیکن تاخیر و مجاہدہ میں حکمت یہ ہے کہ جائے قرار تک پہنچنے کی لذتیں اور اس کی مٹھاس ایسی قدر ہوتی ہے جس قدر سفر کی مشقت ہو۔ چنانچہ قاعدہ ہے کہ آدمی اہل و عیال سے برخورداری کا مزہ اسی وقت پاتا ہے، جب کہ غریب الوطن ہونے کی مشقتیں جھیل چکا ہو۔)

"حاصل جواب کا یہ ہے کہ تجھ میں طلب بھی ہے، ہم میں رحمت بھی ہے، علم بھی ہے، قدرت بھی ہے، جس کے مجموعے سے شبہ پیدا ہوا۔ لیکن اس سب کے ساتھ حکمت بھی ہے اور وہ یہ کہ سفر میں جتنی زحمت ہوگی، اسی قدر وطن کی قدر ہوگی۔"

ان مثالوں سے حضرت کے مواعظ کے مواد و مشتملات، طرز بیان، اسلوب ادا کا اندازہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ نہایت اہم اور ادق مباحث کو مثنوی مولانا روم سے حضرت کس طرح حل فرمادیتے ہیں۔ نیز موقع بہ موقع جس کے اشعار کی کیسی دل نشین تشریح کرتے جاتے ہیں۔

مثنوی اور صاحبِ مثنوی سے حضرت کی غیر معمولی مناسبت کا کسی قدر اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ راقم نے حضرت کے صرف ایک وعظ "روح الصیام" میں مثنوی کے اشعار شمار کیے تو مکررات کو حذف کرتے ہوئے بھی ان کی تعداد ۳۳ تک پہنچ گئی۔

پیر رومی کے بعد وہ دوسرے شاعر جن سے حضرت کو خاص مناسبت حاصل ہے، حافظ شیرازی ہیں۔ موصوف انھیں عارف شیرازی کے لقب سے بھی یاد فرماتے ہیں۔ مولانا روم کی طرح حافظ کے اشعار بھی مواعظِ اشرفی میں بکثرت نظر آتے ہیں۔

اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ حافظ شیراز اصحاب حقیقت اور ارباب مجاز دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اہل باطن اور ان کی شراب کو شرابِ معرفت اور ساقی کو ساقی ازل تصور کرتے ہیں۔ جب کہ ظاہر بین نگاہوں کو ان کی شراب اور ساقی دونوں میں حقیقت کے بجائے مجاز کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر کلام حافظ کا مطالعہ مواعظِ اشرفی کی روشنی میں کیا جائے تو حافظ شناسی کا ایک نیا ہی رُخ سامنے آتا ہے، جس کی لطافت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ حافظ کے دو شعر ہیں:

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم
راحتِ جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسرا ایں غم روزے
تا درِ میکدہ، شاداں وغزل خواں بردم

(وہ دن نہایت مبارک دن ہوگا کہ اس ویران جگہ یعنی دنیا سے چل بسیں گے۔ پھر تو اس وقت ہمیں راحت قلبی نصیب ہوگی اور محبوب کی معیت بھی۔ ہم نے تو منت مان لی ہے کہ اگر غم کے یہ دن گذر جائیں گے تو میکدے کے دروازے یعنی قبر تک خوشی خوشی غزل پڑھتے جائیں گے۔)

حضرت نے ان اشعار کو اس سلسلۂ بیان میں پیش فرمایا ہے کہ جب محبوب حقیقی کی طرف توجہ ہوگی تو کسی اور طرف دھیان نہ ہوگا کیوں کہ خدا کی یاد وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی مشقت

کا پتہ نہ لگے گا اور دوسری مشقت تو کیا خود موت کی مشقت کوئی چیز نہ معلوم ہوگی حافظ کا ایک اور شعر ہے:

حدیث مطرب و مے گو، و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

(مطرب و مے کی باتیں کرو۔ راز دہر کی فکر میں مت پڑو۔ کیونکہ حکمت و فلسفے سے آج تک اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔)

حضرت نے اس شعر میں "مطرب و مے" کو محبت اور اہل محبت کی گفتگو پر محمول کیا ہے اور اس کی روشنی میں یہ سبق دیا ہے کہ حکمت و فلسفے سے اسرار خداوندی حل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ لوح نفس پر صیقل کرو تو وہ نقوش ظاہر ہوں گے کہ حکمت و فلسفہ ان کے سامنے ہیچ ہے۔

ایک مثال اور حضرت نے ایک وعظ "روح الافطار" میں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اہل اللہ جب محبوب حقیقی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں، تو ان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اس وقت اگر کوئی ان کی خدمت بھی کرے تو انھیں ناگواری ہوتی ہے۔ بلکہ انھیں غیر کی مداخلت سے غیرت آنے لگتی ہے۔ اور اس قدر آتی ہے کہ اپنی ان آنکھوں سے بھی آنے لگتی ہے۔ کیونکہ آن جز ہیں اور جز، کل کے مغائر ہے۔ پس غیر سے غیرت آنا طبعی بات ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں: "یہیں سے عارف شیرازی کے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے۔ ورنہ اہل شاعری معلوم ہوتی تھی:

بہ خدا کہ رشکم آید نہ دو چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روے

(خدا کی قسم مجھ کو تو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ ایسے خوبصورت محبوب کو دیکھتی ہیں۔)

یہ صرف چند مثالیں ہیں جو مولانا روم اور حافظ کے سلسلے میں مواعظ اشرفی سے پیش کی گئیں۔ ورنہ ان کے علاوہ حضرت کے مواعظ میں خسرو، عراقی، سعدی، نظامی اور ان کے علاوہ بیسیوں دوسرے شعراء کے اشعار قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ایک مختصر مقالے میں ان سب اشعار اور ان کی توضیحات و تشریحات کو سمیٹنا نہایت دشوار ہے۔ پھر یہ کہ جو مثالیں گذشتہ صفحات میں پیش کی گئیں، گو اس دعوے کے اثبات کے لیے کافی ہیں کہ حضرت تھانویؒ

کے مواعظ سے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ نفس کے فوائد تو حاصل ہوتے ہی ہیں اور یہی ان کا مقصود اصل بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی شعر فہمی سخن سنجی کا ایک خاص ذوق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مقالے ختم کرتے سے پہلے حضرت کے مواعظ کی بعض اور خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان مواعظ میں اردو کی بہت سی ضرب الامثال اور کہاوتیں بھی مع اپنے پس منظری واقعے کے ملتی ہیں، جو نعتیہ شعر و ادب کی کتابوں میں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں ہم صرف دو کہاوتیں درج کرتے ہیں۔ ان کی شانِ ورود وعظ "روح الصیام" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۱) لیکھا جوں کا توں، تو کنبہ ڈوبا کیوں؟

(۲) رات پڑی بوند، نام رکھا محمود۔

دوسرے یہ کہ یہ مواعظ بہت سے حکیمانہ اقوال کا گنجینہ ہیں، جن میں ہر ہر قول غیر معمولی بصیرت و معارفت اور عمیق مطالع و مشاہدے پر مبنی ہے۔ مثلاً:

"پانی تو نعمت ہے ہی، پیاس بھی نعمت ہے۔ کیونکہ اسی سے پانی کی لذت ہے۔"

"عقل حقیقت میں وہ ہے جو رہبر ہو۔ بھولے بھالے اولیاء اللہ مقصود تک پہنچ گئے اور فلاسفۂ یونان ٹھوکریں کھاتے رہے۔"

پاکستان کے مشہور و معروف نقاد جناب محمد حسن عسکری مرحوم، جن کا فرانسیسی و انگریزی ادبیات کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور عالمی ادبیات پر جن کی نظر بہت گہری تھی، آخر آخر میں اس بات کی قائل ہو گئے تھے اور برملا اس کا اظہار بھی کرتے تھے عربی ذوق کی تسکین کے لیے بھی حضرت تھانویؒ کے مواعظ ہی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں ان کے بعض خطوط کے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"اب تو میں بس حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے ملفوظات یا وعظ پڑھتا ہوں۔"

(عسکری بنام شمس الرحمٰن فاروقی، ۲ر اپریل ۱۹۶۹ء)

"میں آج کل ایک انتخاب تیار کر رہا ہوں، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی ایسی تحریروں کا، جن میں ادب کے بارے میں کوئی بات براہ راست کہی گئی ہے، یا جن سے ادب کے بارے میں کوئی مفید بات برآمد ہوسکتی ہے۔"

(عسکری بنام فاروقی، ۲۲ مئی ۱۹۶۸ء)[۲]

آپ حضرات نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ عسکری صاحب کا حضرت تھانوی کی طرف رجحان ومیلانِ عقیدت نہیں، بلکہ بصیرت پر مبنی تھا۔

---

[۲] عسکری بنام فاروقی، شب خون، الہ آباد، جولائی ۱۹۸۰ء

سید مشتاق علی ندوی

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددیؒ

ملفوظات و مواعظ

اس مؤقر مجلس میں سرزمین بھوپال کی ایک بزرگ ترین شخصیت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددیؒ عرف ننھے میاں صاحب کے ملفوظات و مواعظ کا ذکر کر رہے ہیں جو بذات خود وسط ہند اور جنوبی ہند میں ارشاد و مواعظ، تزکیہ قلوب و نفوس میں یکتائے روزگار تھی اور جس کی مختصر و سادہ خانقاہ میں عوام الناس ہی نہیں وقت کے نامور علماء، دانشور، اور اہل دین زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے اور قلب کو جلا بخشتے تھے، اس شخصیت کا صدر رابطہ، جامع انعقاد اور موضوع سے گہرا ربط و تعلق ہے۔

بھوپال

ریاست بھوپال نواب دوست محمد خاں کی حوصلہ مندی سے ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۱۱ء میں قائم ہوئی۔

مفکر و مؤرخ اسلام مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:۔

"جب تقدیر الٰہی نے اسلامی سلطنت کے لیے زوال و اختتام کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کی شامت اعمال سے "غریب الوطن و متاع فروش"، انگریز اس ملک کے فرمانروا بن گئے اور دہلی کی مرکزی سلطنت کے بجائے ہندوستان کے مختلف حصوں میں انگریزی سلطنت کے زیر سایہ متعدد

مسلمان ریاستیں قائم ہوگئیں جہاں مسلمان شرفاء و فضلاء اور اہل کمال بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔

اس وقت مجددیؒ خاندان و سلسلہ کے مشائخ نے انھیں ریاستوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور مختلف شاخوں نے ان ریاستوں میں خانقاہیں تعمیر کیں اور تربیت و اصلاح کا کام شروع کیا۔[1]

ریاست بھوپال حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی کے قدوم سے ۱۲۳۳ھ میں مشرف ہوئی جو حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے اور جو نسباً و نسبتاً اول سے آخر تک مجددی ہیں، مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ نے بھی اپنے والد بزرگوار کی وفات ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۲ھ سے ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۷۰ء تک اسی شمع کو روشن رکھا، مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کی ولادت ۲۱ شوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۸۹ء میں ہوئی اور وفات ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۷۰ء کو ہوئی۔ اس عالی مرتبت شخصیت کے سانحہ ارتحال پر چند نامور علماء و مفکرین کے تأثرات ملاحظہ کیجیے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مفسر قرآن، صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کہتے ہیں دو بزرگ میں نے اپنی زندگی میں بحمد للہ بہت دیکھے ہیں جن کی للّٰہیت اور مقبولیت میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن جہاں تک اصلاح نفس کا تعلق ہے حضرت تھانویؒ کو اپنے تجربہ میں یکتا و بے نظیر پایا، وہی لطف و کیفیت سالہا سال کے بعد اب مجلس یعقوبی میں پائی، حضرت شاہ محمد یعقوب کی صحبت کا اتفاق کل دو بار ہوا، لیکن ان میں اتنا پا لیا بقدر اپنے ظرف و بساط کے جو دوسروں کے ہاں مدتوں میں بھی نہیں مل سکا تھا، ہر تکلّف و تصنع سے مبرا، کامل سادگی، تواضع و

---

[1] صحبتے با اہل دل ص ۲۰

اخلاص کے ساتھ جو بول اس دھن و زبان سے نکلتے تھے موتیوں کے تول ہوتے تھے۔ اللہ اللہ نائب رسول میں یہ نطق پیمبری کی شان اور نطق کیا معنی، سکوت بھی دوسروں کے تکلم پر بھاری ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

مجلس کیا تھی گویا مثنوی معنوی کے دفتر کھلے رہتے تھے وہ بھی زیادہ سلیس و عام فہم ہو کر۔ (نشان منزل ص ۱۵ بھوپال ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء)

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی

حضرت کے انتقال پر ایک تعزیتی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "ہم سب روحانی و علمی طور پر یتیم اور ایک سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے کہ بھوپال کی شانِ یکتائی ختم ہو گئی اور میرے لیے تو اب کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے ناگفتہ سوالات کا جواب ملے اور نئے نئے علوم و نئے نئے مضامین سے اپنا دامن بھر کر لاؤں، واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں ڈیڑھ سو برس سے ایسے معارف و حقائق کا اظہار نہیں ہوا تھا، آنکھیں اب انھیں ڈھونڈیں گی اور نہ پائیں گی، کان مشتاق ہوں گے اور نہ سنیں گے۔" (نشان منزل ص ۹۹ ۱۹۷۰ء)

حکیم الامت قاری محمد طیب صاحبؒ

اپنے گہرے غم و الم کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا، افسوس کہ مدھیہ پردیش کی ایک روشن شمع آج خاموش ہو گئی۔ اور پورا ماحول اندھیرا ہو گیا ایک ربانی عالم اور عارف باللہ کا اٹھ جانا ایک گھرانے یا ایک خاندان کا اندھیرا نہیں بلکہ دنیا کا اندھیرا ہے، موت العالِم موت العالَم، حضرت ممدوح علیہ الرحمۃ کے فیوض و برکات سے ایک دنیا مستفید تھی، کون سا دل ہوگا جو اس صدمہ کی ٹیس محسوس نہیں کرے گا۔

مولانا منظور نعمانی صاحب مدظلہ العالی

لکھتے ہیں، حضرت کی مجالس میں بیٹھنے اور ارشادات سننے کا اتفاق ہوا تو محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کو حکمت کی وہ دولت عطا فرمائی ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً"

صدر رابطہ سے حضرت کا تعلق

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صدر رابطہ سے حضرتؒ کا جو تعلق تھا اس کو سمجھنے کے لیے صرف ایک واقعہ صدر صاحب کے قلم ہی سے سناتا ہوں اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حیدرآباد سے بھی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔

ایک مرتبہ تو ایسا واقعہ پیش آیا جو عمر بھر نہ بھولے گا اور اس کی یاد مدت العمر دل میں چٹکیاں لیتی رہے گی۔ میں حیدرآباد سے آرہا تھا میں نے اپنے معمول کے مطابق مولانا عمران خاں صاحب کو تار دیا کہ میں رات کو پہونچوں گا اور صبح سویرے پنجاب میل سے روانہ ہو جاؤں گا، منصوبہ یہ بنایا کہ رات ۹ بجے کے قریب سدن ایکس پریس پہنچتا ہے وہ وقت حاضری کا نہیں صبح اسٹیشن جاتے ہوئے سلام اور دست بوسی کرتا جاؤں گا، شامت اعمال گاڑی لیٹ ہونا شروع ہوئی اور چار پانچ گھنٹے لیٹ ہو گئی، دسمبر کا غالباً مہینہ تھا سردی غیر معمولی پڑ رہی تھی رات کو جب ڈیڑھ دو بجے گاڑی بھوپال اسٹیشن پہونچی تو میں احتیاطاً دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا کہ شاید مولانا عمران خاں کا قاصد معذرت کے لیے آیا ہو، اتنے میں دیکھا کہ میاں رضوان دوڑے ہوئے آرہے ہیں۔ نزدیک آئے تو انھوں نے کہا کہ حضرت صاحب تشریف لا رہے ہیں اور رات بھر یہیں پلیٹ فارم پر رہے ہیں یہ سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور ایسا شرمندہ اور نادم ہوا کہ کچھ بنائے نہیں بنتی تھی کہ میں نے تار دینے کی غلطی کیوں کی، حضرت تشریف لائے، میں نے ندامت کا اظہار کیا تو فرمایا کہ بڑی اچھی رات کٹی۔ ایسا وقت تو بہت مبارک ہوتا ہے۔

پھر مجھے حکم دیا کہ میں اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہوں بنفس نفیس کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے گاڑی مزید لیٹ ہوئی اور کسی طرح سے یہ سخت وقت کٹا سوائے فنائیت اور "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم" کی عملی تصویر کے آج تک اس کی تاویل سمجھ میں نہ آئی" جب مولانا مدظلہ العالی نے حضرتؒ کو معذرت نامہ لکھا ہوگا تو اس کے جواب میں حضرت نے جو جواب تحریر کیا وہ بھی سنتے چلئے۔

والاصفات عالی تبار جناب مولوی سید ابوالحسن علی صاحب

ادام اللہ برکاتہٗ علینا

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کرمنامہ شرف صدور فرماکر نہایت شرمندہ اور محجوب کیا۔ اس عاجز کو جو روحی آرام اس شب میں حاصل ہوا تھا جس رات کو حضرت کے استقبال میں آرام کیا تھا اسٹیشن پر۔ ایسی خوشی اور فرحت کی کوئی رات مجھ کو اپنی زندگی میں یاد نہیں ہے جسمی کوفت بہت قلیل اور روحی فرحت بہت کثیر، فرحت روحی نے جسمی تکلیف کو دفع کردیا۔ بحمداللہ اب تک میں اچھا ہوں مدّت سے انتظار اس امر کا تھا کہ کوئی موقع ایسا ملے کہ سکوت کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھوں یا کھڑا رہوں۔ اللہ جل شانہٗ کا بے شمار احسان ہے کہ وہ موقع اللہ نے نصیب کیا، اللہ اپنے فضل سے دکھاوے اور ریاء سے بچائے۔ یہی چیزیں موجب برکت اور عبادت ہو جاتی ہیں اور یہی چیزیں موجب معصیت اور گناہ ہوجاتی ہیں، جبکہ مخلوق پر نظر، حضرت کی عنایت اور کرم فرمائی سے جو تازہ کلمات بے ساختہ منھ سے نکلتے ہیں۔ اپنی عنایت بہتری اور برکت سے ان کو مشرف فرماکر مزین فرمادیتے ہیں، یہ سب برکات حضرت کے ہی ہیں، حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد خانقاہ میں جو گفتگو کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ برات سے دولھا تشریف لے گئے ہیں۔ خود ہی کہہ لو اور خود ہی سمجھ لو، یہ سب میرا سبق ہوتا ہے حضرت کے سامنے عرض کرتا ہوں تاکہ اس کی غلطی صاف ہوکر صحیح راہ پر قائم رہوں، اس کبر سنی اور دور آخر میں سکوت زیادہ مفید ہے، کلام کرنے سے۔ مگر بے ساختہ کلام اس مجبوری سے زبان پر آتا ہے کہ اللہ

کے بندے اور میرے احباب اپنی بڑی دولت اور بڑی نعمت ضائع فرما کر مخلوقات کے محتاج ہوئے خالق سے غافل ہو کر کہ شاید یہ بیدار ہو کر وقت سے پہلے اپنی دولت سے فائدہ اٹھالیں اور مجھ کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ اخوت اسلامی مجبور کرتی ہے اس چیز سے آگاہ کرنے پر جو میری سمجھ میں نہیں آئی ان حضرات کے پاس برکات اور حسنات کے بے شمار برکات اور اسباب پاتا ہوں جس سے میں اپنے کو خالی دیکھتا ہوں کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور ضائع نہ کریں ورنہ مجھ کو سکوت کی سخت ضرورت ہے تاکہ اپنا بوجھ ہلکا اور مستقبل ٹھیک ہو، مجھ کو ہر وقت یہ تمنا رہتی ہے کہ میں دن دو دن وہاں گزار کر اپنی غلطیاں اور کوتاہیوں کو صاف کرلوں مگر عوارضات اور ضعف نے سفر کو دشوار کر دیا اس لیے مجبور رہتا ہوں، حضرت کی تکلیف فرمائی اور تشریف آوری بھوپال میں صرف اس عاجز ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام حضرات کے لیے موجب برکت اور موجب ترقی ظاہر و باطن اور اصلاح ظاہری اور باطنی ہوئی جزاک اللہ عنا خیر الجزاء تمام بچے بشوق بہ الحاح سلام عرض کرتے ہیں اور بچیاں بھی سلام عرض کرتی ہیں حاضرین خانقاہ سلام عرض کرتے ہیں[1]

راقم محمد یعقوب مجددی

۲۰ ذیقعدہ ۸۷ھ

۲۰ فروری ۶۸ء شنبہ

حضرت مولانا مدظلہ العالی برابر بھوپال تشریف لاتے رہے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ "ملفوظات قلمبند کرنے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی۔ مولانا علی میاں صاحب ندوی یہ کرتے کہ مجلس میں خاموشی سے سنتے رہتے اور ختم مجلس کے معاً بعد تنہائی میں بیٹھ کر تمام کمال و ملفوظات کو لکھ ڈالتے، قوت حافظہ اور توجہ و التفات کے اس غیر معمولی کمال کو کرامت نہ

---

[1] نشان منزل ۱۹۷۰ء ص ۷۹

کہئے تو اور کیا کہئے "۔ حضرت کے ان ملفوظات کو "صحبتے با اہلِ دل" کے نام سے کتابی شکل میں ۱۹۷ ء میں شائع کروایا، آج کی نشست میں صاحب ملفوظ تو نہیں صاحب ترتیب موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں بمصداق "مشت نمونہ از خروارے" چند ملفوظات آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا، جن میں حکمت بھی ہے اور موعظت بھی، ادبی چاشنی بھی ہے اور بلاغت بھی، مرض کی تشخیص بھی ہے اور دوا کی تجویز بھی۔

جائے انعقاد سے تعلق

اپنی عمر عزیز کے ستر ۷۰ برس اسی شہر میں گزارے ہیں اور یہاں کے قیام کا زمانہ بڑے مجاہدہ اور جفاکشی کا تھا اکثر فرمایا کہ اس ستر ۷۰ سال کی مدت میں زیادہ تر جوار کی روٹی پر گزر کی عید کے موقع پر اس ڈر سے کہ احباب نیا جوڑا بنانے پر اصرار نہ کریں جنگل میں نکل جاتے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ بھوپال میں خود حضرت کے مکان پر ارشاد و ہدایت کا ہنگامہ گرم تھا۔ اور رجوع خلائق اور فتوحات کا یہ حال تھا کہ روپیوں کو گننے کی فرصت نہ تھی تو لے جاتے تھے۔ لیکن یہاں کی فاقہ مستی کو وہاں کی فراخ دستی، تنعم اور صاحبزادگی اور مخدومیت پر ترجیح دیتے رہے۔ اس زمانہ میں اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

بڑے مزے سے گزرتی ہے بے خودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں ہم

موضوع

قرآن مجید نے انسانیت کو رشد و ہدایت سے سرفراز کرنے کے لیے موعظت و تفہیم کے جو اسلوب اختیار کیے ہیں ندائے اقناعی، اسلوب قصصی، آسمانی ہدایت و رہنمائی، تذکیر بایام اللہ و آلاء اللہ ———— علماء ربانیین کے ملفوظات و مواعظ میں بھی اس کا مکمل پرتو ہمیں ملتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب مجددیؒ نے بھی کتب تصوف کو

چھوڑ کر قرآن وحدیث پر اپنی پوری توجہ مرکوز فرمائی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صحبتے با اہلِ دل میں نقل کرتے ہیں۔

"میرے دریافت کرنے پر فرمایا۔ جوانی میں جب میں حیدرآباد میں تھا تو مشائخ کے یہاں تصوف کی کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں خاص طور پر فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا بڑا دور رہتا تھا۔ اور مثنوی مولانا روم کا تو دن رات ورد تھا وحدۃ الوجود کے نکتے بیان ہوتے تھے اور توحید وجودی کے بارے میں موشگافیاں ہوتی تھیں۔ لیکن میری آنکھیں قرآن کی تفسیر اور حدیث کا درس ڈھونڈھتی تھیں اور کان اس کے سننے کے لیے بیتاب تھے۔ جی چاہتا تھا کہ کم سے کم ایک ہی آیت کی تفسیر اور ایک ہی حدیث کی تشریح ہوتی۔ لیکن ان مجالس میں ان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ذوق وشوق، وجد وحال، نعرہ وآہ کی کمی نہ تھی مگر قرآن وحدیث کا سیدھا سادہ بیان مقصود تھا، وجہ یہ ہے کہ قرآن پیری ومشیخت کو توڑتا ہے اور سب کو بندگی اور انسانیت کی سطح پر اتارتا ہے اور سارے استثنائات اور امتیازات کو ختم کردیتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ عرب کا بدّو مجلس نبوی میں آتا ہے تو کسی قسم کے امتیازات ومشیخت کا نشان نہ ہونے کی وجہ سے اس کو پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ میں سے خدا کا رسول کون ہے۔ (ص۶۲)

قرآن مجید میں مثالوں کے ذریعہ بھی بات ذہن نشین کرانے کا اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب بھی روزمرہ اور عام فہم مثالوں کے ذریعے ایمان ویقین کی انگیٹھی گرم کرتے تھے، بڑھاپے کی شکایت کرنے والے کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آخرت اور جنّت مقصود اور نتیجہ ہے اور بڑھاپا اور موت اس کا ذریعہ اور پل ہے اس لیے مجھے تعجّب ہوتا ہے جب کوئی بڑھاپے کی شکایت کرتا ہے اور بڑے درد وحسرت سے کہتا ہے کہ اب مرنا ہی باقی ہے اور موت تو آنی ہے۔ وہ لڑکوں اور جوانوں کو رشک اور حسرت سے دیکھتا ہے کہ کبھی میں بھی ایسا تھا اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان خوشی خوشی کھیتی کرکے جب غلّہ کاٹنے اور اٹھانے کا وقت آئے تو رنجیدہ اور مایوس ہو حالانکہ یہ ساری محنت ومشقّت اسی دن کے لیے تھی۔ اب اس کا افسوس کیوں؟

اب تو غلّہ اٹھانے اور گھر لے جانے کا وقت آیا، حدیث میں آتا ہے کہ جو اللہ کی ملاقات کا شائق ہو اللہ بھی اس کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے، "من أحب لقاء الله احب الله لقائه"، حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندے کے لیے خدا کی طرف سے سلام و پیغام آتا ہے قرآن شریف میں ہے،

"اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ - ص ۶۶

مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، "میناؤں کا ایک جھنڈ گزرا اور انھوں نے آواز دی تو یہ مینا جو پنجرے میں تھی بیقرار ہوگئی اور بہت پھڑپھڑائی بالکل یہی حالت روح کی ہے جب وہ اوپر کی آوازیں سنتی ہے اور وہاں سے اس کے کان میں صدا آتی ہے کہ یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ"

تو وہ بھی پھڑپھڑاتی ہے اور اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ یہ پنجرے کی تیلیاں توڑ کر وہ بھی اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کرے اور اپنے ہم جنسوں میں جا ملے لیکن وہ پنجرے سے مجبور ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں جسم ضعیف ہو جاتا ہے "ومن نعمره ننكسه في الخلق" گویا قفس کی تیلیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ اور روح کو آزاد ہونے میں آسانی ہوتی ہے اس لیے بڑھاپا موجب شکر و مسرّت ہے نہ کہ موجب شکایت و حسرت،، ص ۶۷

اسی طرح حضرت موصوفؒ قرآن کے ساتھ حدیث اس کی اہمیت و ضرورت اور فضیلت کی طرف بہت ہی لطیف انداز سے متوجہ فرماتے، ادعیہ ماثورہ اور جو دعائیں بزرگوں سے منقول ہیں اس کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی مصیبت ڈالتا ہے تو اس سے پہلے صبر و شکر کی قوت اور یقین کی نعمت عطا فرماتا ہے ورنہ مصیبت کا تحمل مشکل ہے اسی طرح سے دعاؤں کے جو معنا ہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو تلقین فرمائے ان سے پہلے قبولیت کا فیصلہ فرمالیا، جس طرح کوئی حاکم جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو امیدوار کو خود ہی عرضی کا مضمون لکھوا دیتا ہے یہ صرف ادعیۂ ماثورہ کی خصوصیات ہے بزرگوں سے جو دعائیں منقول ہیں وہ اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتیں۔ بزرگوں کی دعاؤں کی مثال پرندہ کی ہے جو خود اڑتا ہے اور قرآن مجید اور حدیث کی دعاؤں کی مثال ہوائی جہاز کی سی ہے، جو سیکڑوں کو لے کر اڑتا ہے، اسی لیے سورۂ فاتحہ میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے ایاک نعبد وایاک نستعین ہ اھدنا الصراط المستقیم، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، دکھا ہم کو سیدھا راستہ۔

مجھے حزب البحر وغیرہ سے کچھ مناسبت نہیں مثلاً اس میں دعا آتی ہے کہ اللّٰھمّ سخرلی کل شئ اب اگر سب مخلوق میرے لیے مسخر ہو جائے تو میں ان کو کھلاؤں گا کہاں سے، اس کے بجائے میری دعا یہ ہے اللّٰھمّ سخرنی للک، اے اللہ مجھے اپنا مطیع و فرمانبردار بنالے۔ ص۷۷

قبولیت دعا راز

فرمایا ـــــ لوگ دعا میں اپنے مقصود پر اور ان لوگوں پر نظر رکھتے ہیں جن سے وہ مقصود حاصل ہو سکتا ہے اور نہیں ہوتا، میرے یہاں ایک کاریگر دن بھر بجلی کی وائرنگ اور فٹنگ کرتا رہا اس نے بڑی محنت اور خلوص سے کام کیا میں نے اس کو انعام دینا چاہا کسی طرح قبول نہ کیا مجھے اس کے جذبہ کی بڑی قدر ہوئی، ایک دن میں صحن میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ وہ آیا اور زار و قطار رونے لگا میں سمجھا کہ اس کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا، میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں بہت دن سے روزگار کی تلاش میں ہوں لیکن کوئی پوچھتا بھی نہیں جہاں جاتا ہوں ناکام واپس آتا ہوں، میں نے کہا کہ میں تم کو خوش خبری دیتا ہوں کہ تم یوں ہی ناکام رہو گے، اور کوئی تمہاری بات بھی نہیں پوچھے گا، وہ گھبرایا اور اس نے کہا کیوں؟ میں نے

کہا نوکری نہ ڈھونڈو خدا کو ڈھونڈو تمہاری نظر مخلوق پر ہے خدا پر نہیں ہے تم اس کو منانے کی کوشش کرو کام خود تمہارے پاس آئے گا فرمایا کہ وہ شخص اگرچہ جاہل تھا لیکن یہ بات فوراً اس کی سمجھ میں آگئی اگر پڑھا لکھا اور مولوی ہوتا تو اتنی جلدی نہ سمجھتا، علم بڑا حجاب ہے چند دن کے بعد وہ بڑا خوش خوش آیا اور کہا کہ مجھے کام مل گیا اور کارخانے والے خود میرے گھر آئے اور مجھے لے گئے، تنخواہ بھی کی اور سواری کے لیے سائیکل بھی دی وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا میں نے کہا یہ شرک ہے اس کا شکریہ ادا کرو جس نے نوکری دی ہے اسی طرح چند آدمی میرے پاس آئے انھوں نے کہا کہ ہماری زمین نیتی (سرکاری پیمائش) میں آگئی ہے اور ہم کو وہ قیمت دی جا رہی ہے جو پہلے کبھی تھی میں نے کہا کہ اس پر نظر رکھو (اور اس کو راضی کرو) جو ان لوگوں کو گٹی کی طرح بیس کر سڑک پر بچھا سکتا ہے، تیسرے دن وہ آئے اور کہا کہ اسکیم بدل گئی اور زمین بچ گئی۔ ص ۷۹

مشائخ کی تقلید و اتباع

صاحب ملفوظات، اللہ اور رسول کی اتباع و طاعت کامل پر زور دیتے ہیں اور اسی میں کامیابی و کامرانی مضمر بتاتے ہوئے علماء و مشائخ کی اتباع و تقلید کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

فرمایا ـــــ لوگوں نے مشائخ کی اتباع میں بہت غلو کر رکھا ہے ان کی نقل و تقلید کو مقصود اور ان کی اطاعت کو اطاعت مطلق سمجھتے ہیں حالانکہ اصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور ان کا اتباع ہے، مشائخ اس کا ذریعہ ہیں، کہنے والوں نے یہاں تک کہا ہے۔

ان کے کوچہ کی خاک لائیں گے
اپنا کعبہ الگ بنائیں گے

مشائخ و علماء کی نقل و تقلید اور اتباع و پیروی کی جو حقیقت ہے اور اس کے جو حدود ہیں اس کا نمونہ نماز میں نظر آتا ہے کہ امام کی تکبیر پر قیام اور رکوع کیا جاتا ہے اور

ہر رکن اور جز میں اس کی پیروی کی جاتی ہے لیکن جب اس کو سہو ہو جاتا ہے تو مقتدی اللہ اکبر کہنے لگتے ہیں (یا سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے) یا اللہ اکبر سبحان اللہ بھی ایک طرح کی مختصر نویسی یا شارٹ ہینڈ ہے جس میں بہت بڑی عبارت مضمر ہے یعنی یہ کہ اب آپ سے سہو ہو گیا ہے آپ اس کی اصلاح کیجئے، گویا مقتدی بجائے اس کی پیروی کرنے کے اس کی رہبری کرنے لگتے ہیں اسی طرح مشائخ و علماء چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہیں اس لیے ہم ان کے قدم پر چلتے ہیں، اس لیے ہم ان کے قدم پر قدم رکھتے ہیں گویا اصل پیروی رسول کی ہے"۔ ص۸۸

ائمہ کی تقلید اور پیروی کی مثال

بعض اہل علم جو کسی ایک امام کے پیرو نہیں اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ ائمہ کی پیروی کا کیا ثبوت اتباع تو اللہ اور رسول کتاب و سنت کا مطلوب ہے حالانکہ دراصل ائمہ اور علماء کی بالذات پیروی اور اطاعت نہیں بالذات اور بالاستقلال پیروی تو اللہ اور رسول ہی کی ہے لیکن عرف میں اسی طرح کہا کرتے تھے کہ ہم فلاں کے متبع ہیں اور فلاں کے مقلد۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے کلثوم بی کی مسجد میں نماز پڑھی دوسرا کہتا ہے کہ میں نے اللہ کے گھر میں نماز پڑھی، ایک ناواقف آدمی دوسرے ہی کو فضیلت دے گا کہ اس نے براہ راست اللہ ہی کے گھر نماز پڑھی ہے۔ حالانکہ پہلے نے بھی مسجد میں نماز پڑھی ہے دوسرے نے بھی مسجد میں لیکن عرف میں فلاں کی مسجد فلاں کا محلہ کہتے ہیں حقیقت میں سب اللہ ہی کے گھر ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت یوسفؑ فرماتے ہیں:

واتبعت ملۃ آبائی ابراھیم واسحٰق ویعقوب حالانکہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کے متبع تھے۔ ص۱۰۵

بندگی سب سے اونچا مقام ہے

اللہ کی فرمانبرداری اور رسول کی اتباع کامل

سے مقصود یہ کہ انسان کے اندر کامل بندگی پیدا ہو جائے اور یہی سب سے اونچا مقام ہے فرماتے ہیں کہ ——— بندگی اور اپنے کو مٹانا سب سے اونچا مقام ہے، بے نفسی خود افکاری اور اپنے کو خاک و خس و خاشاک سمجھ لینے سے بڑھ کر کوئی مرتبہ اور کمال نہیں، امام ربانی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں سے کرامات کا بہت ظہور ہوا ہے ان کو قیامت میں تمنا ہوگی کہ کاش ایسا نہ ہوتا، ص ۹۱

ہم اپنے نفس پر اللہ کی حکومت قائم نہ کر سکیں تو دوسروں پر کیا کریں گے

صاحب ملفوظات اس پر زور دیتے ہیں کہ پہلے اپنی اصلاح و درستگی کی فکر کی جائے ورنہ بغیر اس کے دوسروں پر حدود کس طرح جاری کی جا سکتی ہیں۔ فرماتے ہیں ——— کہ پہلی ضرورت اخلاق و معاملات کو درست کرنے اور نفس کی اصلاح اور اس کو مغلوب کرنے کی ہے جب تک نفس کا تسلط دور نہ ہوگا نہ اطاعت کا جذبہ پیدا ہوگا نہ ایثار و قربانی کا مادہ، جب ہم اپنے نفس پر اللہ کی حکومت قائم اور اس کے حدود کو جاری نہیں کر سکتے تو دوسروں پر کیا اللہ کی حکومت قائم اور اس کے حدود جاری کر سکیں گے؟ اخلاق و نفس کی اصلاح سے پہلے اگر ہم نے حدود شرعیہ کے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ تو فتنے پیدا ہو گئے اور بغاوت ہو گئی۔ ۱۵

تکلیفات شرعیہ اوپر سے مشقت ہیں اندر سے راحت اور باغ جنت

جب بندگی اور اطاعت اور فرمانبرداری پیدا ہوتی ہے تو تکلیفات شرعیہ جو بظاہر مشقت معلوم ہوتی ہیں راحت و باغ جنت معلوم ہونے لگتی ہیں۔

فرمایا ——— حضرت ابراہیمؑ کو جس آگ میں ڈالا گیا وہ اوپر سے آگ تھی اندر سے گلزار، حضرت ابراہیمؑ نے اس آگ کے اندر گلزار کو سمجھ لیا۔ فرعون کے سامنے جو سمندر تھا وہ اوپر سے پانی تھا اندر سے آگ اس نے پانی کو دیکھا آگ کو نہیں دیکھا تکلیفات شرعیہ کا یہی حال ہے کہ اوپر سے وہ مشقت اور ظاہر میں عمل و مجاہدہ اندر سے راحت و قرب و ترقی و جنت ہے۔ ص ۱۰۷

مشہور حدیث ہے۔ حفت الجنة بالمکارہ وحفت النار بالشہوات۔

دل دولھا اور جسم بارات

صحیح حدیث میں ہے اَلا اِن فی الجسد مضغة اِذا اصلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله اَلا وھی القلب،، آج زندگی کا سارا فساد اور سارا انتشار اسی اندرونی کثافت وظلمت کا نتیجہ ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں حضرتؒ نے فرمایا:-

دل دولھا ہے اور جسم بارات، بارات دولھا ہی کی خاطر ہے دولھا سے بے اعتنائی اور بارات کی خاطر داری کوئی عقل کی بات نہیں، یہی دل سرالٰہی ہے اور امانت خداوندی اہل زمانہ دل کی اصلاح اور غذا سے غفلت برتتے ہیں۔ بعض لوگ جو غفلت کے دام سے نکل گئے ہیں وہ دل کے معاملے میں دوسری قسم کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور ان میں بعض خواص بھی بعض اوقات مبتلا ہو جاتے ہیں، مجھے مومن خاں کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ لکھ کر وظیفہ کی کتاب میں رکھ لوں ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ذکر کی جگہ خلوت نہیں جلوت ہے

جب دل غفلت وجفا سے باز آجاتا ہے تو ہمہ وقت متوجہ الی اللہ رہتا ہے حضرتؒ فرماتے ہیں ——— ذکر کی جگہ خلوت نہیں جلوت ہے، جب جلوت میں ذکر کی مشق اور قوت پیدا ہو جاتی ہے تو خلوت میں خود بخود ذکر ہونے لگتا ہے، جو لوگ بازاروں اور ہنگاموں کے انتشار میں متوجہ الی اللہ ،، دست بکار دل بیار،، رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان سے خلوت میں غفلت ہونی مشکل ہوتی ہے، اور ان کو تنہائی میں

ذاکر اور متوجہ ہونے کے لیے کوئی تکلف اور اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔

اصل چیز نقل چیز پر ہمیشہ غالب آتی ہے

فرمایا موت کے وقت شوق کی ضرورت ہے۔ اگر زندگی میں اللہ سے اور عالم آخرت سے انس نہ ہوا تو کچھ نہ ہوا محض عقلی دلائل معلومات و مطالعہ کام نہیں آئے گا اندرونی چیز درکار ہے اصل چیز نقلی چیز پر غالب آتی ہے۔ فطری علم کسبی پر غالب رہتا ہے طوطے کو برسوں حق اللہ حق اللہ سکھایا جب بلّی نے گلا دبایا تو ٹیں ٹیں کرنے لگا جب ملک الموت نے گلا دبایا تو اوپر کا ذکر غائب ہو گیا اور اندر کی چیزیں ابھر آئیں۔

اعضاء جوارح اگر حقیقت و روح سے خالی ہیں تو مضغہ گوشت ہیں، دواؤں کے اندر کی بجلیاں مطلوب ہیں نہ کہ ان کے جسم، مری اور سوکھی دواؤں سے مطلوب حاصل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم الغافلون"

یہ نسخہ بتا دیا کہ غفلت کو دور کرو، پھر پیر کی ضرورت نہیں قرآن خود پیر بن جاتا ہے۔ ص ۱۱۷

کمیونسٹ اور ترقی پسند سب پابندی اختیار کرتے ہیں آزادی کا دم بھرتے ہیں

حضرت عام فہم انداز میں جدید ذہن روشن خیال لا مذہب اور مذہب بیزار لوگوں کو بھی ان ہی کی زبان میں روحانی و ایمانی غذا فراہم کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ تقیدات اور پابندیاں ضروری ہیں، لا مذہب ملحد، کمیونسٹ سب تقیدات اختیار کرتے ہیں لیکن آزادی کا دم بھرتے ہیں ایک چیز بڑے شوق سے کھاتے ہیں لیکن اس کے کسی خاص نام سے چڑتے ہیں ایک مرتبہ کچھ بچے جمع تھے کسی نے کہا میں فلاں چیز سے چڑتا ہوں، ایک بچے نے کہا میں ترئیوں سے چڑتا ہوں اور وہ کبھی نہیں کھاتا، ایک مرتبہ ترئیوں کا سالن

رکھا کسی نے کہا یہ تر ئیاں ہیں وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں تر ئیاں نہیں کھاتا، ماں نے پیچھے سے آکر کمر پر ہاتھ رکھا اور کہا بیٹا یہ تر ئیاں نہیں لریاں ہیں بس بیٹھ گیا اور کہا میں تر ئیاں نہیں کھاتا ہوں، اسی طرح بہت سے لوگ لریوں کے نام سے تر ئیاں کھا رہے ہیں، آزادی کے نام سے پابندی کی زندگی گزار رہے ہیں اور بہت خوش ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔

قرآن تغیر کا مطالبہ کرتا ہے

حضرت دین و دنیا کی دوئی کے قائل نہیں بلکہ دین نام اس کا ہے کہ پوری زندگی قرآن شریف کے مطابق ہو جائے، اسی طرح آپ اکثر فرماتے۔ "اگر کسی کا دین دیکھنا ہو تو اس کی دنیا دیکھو" ایک مرتبہ فرمایا: لوگوں کو اپنے ذوقی دائرہ کے اندر محنت و ترقی کرنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے جس کو ذکر و شغل کا شوق ہے وہ ذکر و شغل میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، جس کو عبادت کا شوق ہے وہ عبادات میں اور اضافہ کر لیتا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا، تبلیغ میں ایک چلّہ دینے والوں کو تین چلّے بہت آسان معلوم ہوتے ہیں، لوگ وظائف پر وظائف پوچھتے رہتے ہیں ختم پر ختم پڑھتے رہتے ہیں لیکن اگر کسی مرغوب چیز کو چھوڑنے یا شریعت کے کسی حکم کو اختیار کرنے کے لیے کہا جائے یا کسی رسم کو ترک کرنے کے لیے تو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے، حالانکہ قرآن مجید سب سے زیادہ تغیر کا مطالبہ کرتا ہے۔[۲۶]

ہم لوگوں کا دین شطرنج کے کھیل سے بھی زیادہ بے وقعت ہے

روشن خیال طبقہ بزعم خود کبھی کبھی ایسی باتیں اور تجویزیں پیش کرتا ہے جس سے دین کے اندر تبدیلی اور حالات کے ساتھ تغیر و تبدل کی بو آتی ہے۔ اس ذہن پر حضرت نے بہت ہی سبک انداز میں ضرب لگائی ہے۔ فرماتے ہیں ——— دین داروں کو شطرنج کھیلنے والوں سے سبق لینا چاہیئے کہ وہ اپنے اصولوں کے کتنے پابند ہوتے ہیں کتنا ہی کہئے کہ اس موقع پر فیل کو آگے بڑھا دیجئے گھوڑا اڑھائی خانے چلتا ہے اس کو آگے چلا دیجئے وہ نقصان پر نقصان برداشت کریں گے، مات پر مات کھائیں گے مگر ایسا نہیں کریں گے، پوچھئے گا

کیوں نہیں کرتے؟ کہیں گے یہ شطرنج کے اصول وضوابط کے خلاف ہے، اللہ اکبر! کھیل اور بازی کے اصول وضوابط کی اتنی پابندی! ہم لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے دین کیا ہے؟ شریعت کے اصول کی پابندی اپنی خواہشات ومصالح کو شریعت کے احکام اور آسمانی تعلیمات کے ماتحت کردینا ہے فائدہ ہو چاہے نقصان، جیت ہو چاہے ہار، یہی مضمون ہے اس حدیث پاک کا جو کل مکتوبات شریف میں پڑھی جارہی تھی کہ لایؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعًا لما جئت بہ (تم سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات نفسانی اس ہدایت کے تابع نہ ہوجائیں جس کو میں لے کر آیا) میدانی کھیلوں میں بھی یہی دیکھا ہے کہ جو جس جگہ کھڑا کردیا گیا کیا مجال جو اس جگہ سے ہٹے جو وردی مقرر ہے ضرور پہنی جائے گی، کھیل کے جو ضوابط ہیں ضرور پورے کیے جائیں گے کیا دین کا معاملہ کھیل سے بھی کم اہم ہے۔ ص ۱۲۹

امراء پہلے خاطر کرتے ہیں پھر سوالات

اہل ثروت کی ایک خاص ذہنیت کی اصلاح کرتے ہیں اور ساتھ علماء ودین داروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ان کی چالوں سے ہوشیار رہیں فرمایا کہ ـــــ میں اجین میں ایک بڑے وکیل صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، شہر میں کچھ غریب لوگ بھی تھے جن کا سلسلہ اور ہماری خانقاہ سے قدیم تعلق تھا میں نے بہت چاہا کہ میں ان کے یہاں منتقل ہوجاؤں، غریبوں کے یہاں آرام زیادہ ملتا ہے، مگر وکیل صاحب نے اصرار کیا کہ ایک رات تو ٹھہر جایئے، پھر دسترخوان بچھا، کھانا بہت پرتکلف اور انواع واقسام کا تھا، یہ حضرات پہلے خاطر کرتے ہیں آدمی کو ممنون بناتے ہیں پھر سوال کرتے ہیں تاکہ جواب مرضی کے مطابق ملے، کھانے کے دوران انھوں نے پوچھا کہ حضور عالم الغیب تھے یا نہیں؟ میں نے کہا پہلے غیب کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ غیب کہتے کسے ہیں؟ غیب ایک اضافی چیز ہے آپ اپنے گھر کے غیب کے عالم ہیں میں اپنے گھر کے غیب کا عالم ہوں ـــــ آپ کے گھر کے اندر کی چیزیں آپ کے لیے شہود ہیں

میرے لیے غیب، میرے گھر کے اندر کی چیزیں میرے لیے شہود ہیں آپ کے لیے غیب، اس طرح ایک معنی میں آپ کو کچھ مغیبات کا علم ہے مجھے بھی کچھ مغیبات کا علم ہے، پھر یہ بتایئے کہ حضور اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں یا خود پیدا ہو گئے ہیں، انھوں نے کہا کہ اللہ نے آپ کو پیدا فرمایا، میں نے کہا کہ آپ خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں تو آپ کی تمام صفات بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ذات حادث ہو اور صفت قدیم اس لیے آپ کی صفات اللہ کی صفات کی طرح قدیم نہیں اس پر وہ خاموش ہو گئے، ص۱۳۰

مٹھائی کے ساتھ چٹنی بھی ضروری ہے

بعض ایسے زاہد خشک ہوتے ہیں کہ بات بات پر غصہ کرنا اور مشتعل ہو جانا یا ہی گفتگو و معاملہ میں بھی اپنی حیثیت و مقام کو نمایاں رکھنے کی کوشش کرنا ایسے لوگوں کے چند واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ان حضرات کے واقعات کو دیکھ کر وہ حدیث سمجھ میں آئی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا کھیل اور کرتب دکھائے اور آپ کبھی کبھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ بھی فرماتے تھے، اصل یہ ہے کہ مٹھائیوں کے ساتھ چٹنیوں کی بھی ضرورت ہے۔ حیات طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں مٹھائی کے ساتھ چٹنی بھی تھی، جس سے طبیعت کا اعتدال اور مزاج کی شگفتگی باقی رہتی ہے ان حضرات نے مٹھائیاں تو لے لیں، چٹنی چھوڑ دی، میں نے اکثر گوشہ نشین زاہدوں اور صحبت و اختلاط سے بچنے والوں کو غیر متوازن اور سنکا ہوا پایا۔ مٹھائی کے ساتھ چٹنی ضروری ہے، ورنہ معدہ خراب ہو جائے گا اور طبیعت اعتدال سے ہٹ جائے گی۔ ص۱۴۲

وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ کا بلیغ ترجمہ

انس و محبت وہ چیز ہے کہ مانوس اور محبوب کا نام آتے ہی نبض تیز ہو جاتی ہے قرآن مجید نے یہی تھرمامیٹر ہم کو دیا ہے فرمایا:۔

اِنّما المومنون الذین إذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم اٰیاتہٗ زادتھم ایمانا وعلیٰ ربھم یتوکلون۔

وجلت قلوبھم، یعنی ان کی نبض تیز ہوجاتی اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے کہ ان کو اس نام کی لذّت حاصل ہے اور اس ذات سے عشق ہے۔

اذا تلیت علیھم اٰیاتہ زادتھم ایمانا۔ یعنی ان کو ایک نیا لطف اور نیا ذوق حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ہر نماز نئی ہوتی ہے اور ہر بار کا ذکر نیا ہوتا ہے۔[۱۴۹]

ریت کے ذرّے یا پتھّر کی چٹان

فرمایا: ایک دن حاجی فضل الرحمٰن صاحب جامع مسجد میں جمعۃ الوداع کی نماز پڑھ کر آئے اور کہنے لگے کہ آج جامع مسجد میں بہت آدمی تھا، میں نے کہا کہ ریت کے ذرّوں کی طرح تھے یا پتھّر کی طرح؟ ریت کے ذرّے تو ہوا کے جھونکوں سے ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف اڑتے رہتے ہیں، میں نے ۱۳۲۳ھ میں پہلا حج کیا، میں جدّہ اور مکّہ کے راستہ میں دیکھتا تھا کہ کبھی ریت کا پہاڑ راستہ کے دائیں طرف کھڑا ہے کبھی بائیں طرف، جدھر کی ہوا ہوتی ہے ریت اسی طرف چل دیتی۔ لیکن جب یہ ذرّے ایک دوسرے سے پیوستہ ہوجاتے ہیں تو پتھر کا ایک ٹکڑا ہوجاتا ہے، جو اگر کسی کے منھ پر مار دیا جائے تو کام تمام کردے، اسی کو کہا گیا ہے۔ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللّٰہ مع الصابرین۔ ص۱۵۴

یہ دور پریشانی کا نہیں فرحت کا دور ہے

مسلمان کو ہمیشہ رجائی ہونا چاہیے قنوطی نہیں بقول علاّمہ اقبالؔ۔ ع

امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

حضرت بھی ہر وقت مسلمانوں کی طرف سے پُرامید ہیں اور ان کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنے

اسلاف کے نقش قدم پر چل کر آج پھر وہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

فرمایا ـــــ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام پر بڑا نازک وقت آیا ہے مسلمانوں پر بڑی پریشانی کا دور ہے میں کہتا ہوں بڑی فرحت کا دور ہے، اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر وقت فرحت ہی کا زمانہ ہے۔ دیکھئے اسلام کی تاریخ میں جنگ احد سے زیادہ کوئی سخت وقت نہیں آیا۔ ستر جلیل القدر صحابی شہید ہوئے، حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا گیا؟ دندان مبارک شہید ہوئے، چہرہ مبارک پر ایسے گہرے زخم آئے کہ حضرت فاطمہؓ نے چٹائی جلا کر اس کی راکھ بھری، ان سب کے بعد ابوسفیانؓ اور حضرت خالدؓ نے جو اس وقت کفار کے قائد تھے للکارا کہ ابھی کیا ہوا ہے ایک اور فوج آرہی ہے وہ تمہارا رہا سہا کام کرے گی لیکن اس حالت میں صحابہ کرامؓ کے ایمان و یقین اور فرحت و انبساط میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

یہ جرمنی ایمان ہے جاپانی نہیں، جب ٹکر لگی تو معلوم ہوا کہ کتنا پختہ ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو کسی نے پچھاڑ دیا اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور چھرا نکال کر اس کو دکھایا کہ اب تیری مدد کون کرے گا اور تجھے اس وقت کون بچا سکتا ہے، اس نے کہا اللہ، چنانچہ ایک تیر پیچھے سے آیا اور وہ شخص گرا مسلمان نے اس کا چھرا لے کر اس کو ذبح کر دیا۔ اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں بہت آئے ہیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ جدھر کی ہوا چلی ادھر کو مڑ گئے، ص ۱۵۹

صحابہ کرام کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں

مشاجرات صحابہؓ کے سلسلہ میں سلف صالحین کا طریقہ سکوت ہی کا ہے حضرت نے اس کو ایک عام فہم مثال کے ذریعہ کتنے اچھے اسلوب میں سمجھایا، فرمایا: یہاں ایک صاحب تشیع سے متاثر تھے ایک دن کہنے لگے کہ کیا امام حسینؓ کی شہادت کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ اور

بچھاتا ہے اس پر نہایت مکلّف بستر بچھاتا ہے، بڑا نرم گدا، بڑی اُجلی چادر، بڑا نفیس منقش تکیہ لیکن آدمی جب رات کو اس پر سوتا ہے تو اتنے کھٹمل اور چیچڑیاں کہ بھن جاتا ہے اور پلک سے پلک نہیں لگتی، اب مہری اور گدے کو لے کر کوئی کیا کرے اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ زمین پر معمولی بستر ڈال کر سو جائے، جہاں نہ کھٹمل ہوں نہ پسو، مقصود تو آرام ہے چاہے زمین پر ہو چاہے مہری پر آج کل کی زندگی تعلیم سب ایسے ہی ہیں کہ ٹیپ ٹاپ تو بہت ہے مگر قبر میں اس سے آرام نہ ملے گا۔ اس سے تو وہ تکلیف اور بے سروسامانی مبارک ہے کہ جس کے نتیجہ میں قبر میں آرام سے سونا نصیب ہو وہاں گدا تکیہ سب مل جائے گا اور آدمی ایسا مسرور اور با آرام ہوگا کہ کہے گا یارب أنتم الساعة حتی ارجع إلی اهلی ومالی،، ص۱۶۶

دین موقع سے کام کرنے کا نام ہے

حضرتؒ کے یہاں فرار عن الدنیا نہیں اور یہاں کی نعمتیں شجرۂ ممنوعہ نہیں بلکہ ان کے اندر تنظیم و ترتیب ہے اس کو اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں فرماتے ہیں۔ دنیا کا سب آرام اور ہر طرح کی راحتیں ہمارا حق ہیں، لیکن ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک وقت ہے ایک وقت دیکھنے کو بھی منع کرتے ہیں اور دوسرے وقت نہ دیکھنے کو برا سمجھتے ہیں، جس کی ابھی صرف نسبت ہوئی ہے اس کا جھانکنا بھی معیوب اور گھر کے اندر چلا جانا بھی ممنوع ہے لیکن شادی کے بعد الگ رہنا قابل اعتراض ہے۔ یہی تمام لذات کا حال ہے کہ ان سے تمتع کا ایک وقت اور ایک محل ہے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے موقع اور قبل از وقت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلوغ کے بعد جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں وہ بلوغ سے پہلے ممکن نہیں جس کو ہم فسق و فجور کہتے ہیں وہ درحقیقت وقت سے پہلے کسی کام کو کرنا اور اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ پر قناعت کرنا، یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی تاڑی یا ٹھرا پی رہا ہو اور کوئی کہے یہ شراب نہ پیو ہم ولایت سے منگائے دیتے ہیں، وہ کہے گا پھر منگا دو تو اس سے کہا جائے گا کہ ٹھہرو آنے میں وقت لگے گا، اللہ تعالیٰ نے ان جذبات کو اپنے محل میں صرف کرنے کا حکم دیا ہے قرآن

ان کے طرز عمل پر عائد نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑے عالم اور ان کی بیوی میں رات کو کچھ تکرار ہوگئی اور سخت درشت کلامی کی نوبت آگئی ایک صاحب جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے، صبح کہنے لگے کہ صاحب شریعت گھر کی بیٹی، آپ عالم آپ اس کو اتنا سخت وسست کہہ رہے تھے اور زدوکوب کی نوبت آگئی۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی، کہا میں جھانک کر دیکھ رہا تھا، کہا کہ میں اپنے عمل کی توجیہہ بعد میں کروں گا پہلے آپ اپنے عمل کا جواز ثابت کیجیے کہ آپ کو کسی کے خلوت خانے میں جھانکنے کی اجازت کس نے دی؟ اس کی تو ممانعت ہے میں نے کہا کہ اسی طرح ہم کو صحابہ کرام پر اعتراض کرنے اور ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ہے۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا، اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کو قانون وعدالت کی کرسی پر کس نے بٹھایا کہ آپ صحابہ کرامؓ پر فیصلہ صادر کریں بہت سے لوگ قرآن وحدیث کے بجائے تاریخ پڑھ کے گمراہ ہوئے۔ ص ۱۶۵

کسی نے سلف میں کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ میں کون برحق تھا، کہا تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم، ہم کو اپنے اعمال واخلاق کی فکر چاہیئے۔ ان کی فکر میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، نواب صاحب کے یہاں شادی ہے میں احمدآباد دوڑا جارہا ہوں کہ کچھ فکر کروں کوئی کہے حضرت آپ کے یہاں نون تیل بھی ہے یا نہیں، آپ اپنے گھر کی فکر کیجیے، بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کے لیے بہت کچھ سامان کر رکھا ہے وہاں سب انتظامات ہورہے ہیں، کسی کی ایک حرکت دیکھ کر پوری زندگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک حدیث دیکھ کر کیسے اندازہ کر لیا جائے، کبھی آپ غصہ میں ہوتے تھے، کبھی ترحم اور شفقت کی حالت میں معاویہؓ کی غلطیاں بھی ہمارے لیے رحمت ہیں۔ ص ۱۶۶

ہر چیز کی قیمت اس کی غایت

فرمایا:— ہر چیز کی علت غائی دیکھنی چاہیئے جس کے لیے بنائی گئی ہے ایک شخص مہری

شریف میں آتا ہے "ولکم فیھا ما تشھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون۔ دیکھئے یہ نہیں فرمایا ولکم فیھا ما تشھی ارواحکم، معلوم ہوا کہ ان لذّات کی اشتہا نفوس کا کام ہے نہ کہ ارواح کا، مومن جنّت میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام میں پہنچ جائے گا کہ وہ اس محل میں رکھا جائے گا جہاں صرف دیدار الٰہی ہے نہ حور و قصور۔ ص۱۶۷

المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف

ارشاد نبوی کے تحت مومن کو قوی و صحت مند ہونا چاہیئے اور اس کا راز ہے کہ انسان کے اندر بے فکری و استغناء ہو، اس کو حضرت یوں فرماتے ہیں ـــــ جب میں کسی (کھاتے پیتے) آدمی کی نبض دیکھتا ہوں اور کمزور معلوم ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ یا تو اس کے پاس مال زیادہ ہے یا مال کی محبّت، اکثر لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں، جس کا قرآن میں ذکر کیا گیا " یا لیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظ عظیم" یعنی اہل دولت پر رشک اور مال کی کثرت کی تمنا، میں نے ایسے بہت سے لوگوں کا ہارٹ فیل ہوتے دیکھا جو اس مرض سے آزاد ہے وہ تندرست اور قوی و توانا ہے، میرے بعض ساتھی کہنے لگے کہ آپ کی تندرستی بہت اچھی ہے میں نے کہا آپ بھی یاقوتی کھایا کرو تندرست رہو گے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھ کر کہا کہ آپ جھکے نہیں؟ میں نے کہا کہ میں جھکتا رہتا ہوں اس لیے نہیں جھکا جو شخص بھی ننانوے کے پھیرے میں پڑا، الذی جمع مالا وعدده یحسب ان ماله اخلده وہاں اس کو تفکرات اور پریشانیوں نے گھیرا، ص۱۶۸

مناظرہ کا صحیح طریقہ

فرمایا ـــ مجھے بحث و مناظرہ کا یہی طریقہ پسند ہے کہ بغیر دل آزاری کئے اور ضد و نفسانیت کو ابھارنے والی باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی بات سمجھانے اور دل نشیں کرنے کی کوشش کی جائے، مناظرہ کا وہ طریقہ پسند نہیں جس کو دندان شکن کہا جاتا ہے۔ ص۱۶۶

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا کارنامہ

فرمایا ــــ ان صوفیوں سے جس قدر ضرر پہنچا ہے دوسروں سے نہیں پہنچا، بہت سے حضرات ایسے ہیں کہ جہاں علم کا ذکر آیا کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو ملا ہیں تصوّف سے ان کو حصّہ نہیں ملا۔ یہ تو حضرت مجدّدؒ کا کارنامہ ہے کہ طریقت کو بالکل شریعت کے تابع بنادیا، فرماتے ہیں کہ دوپہر کا قیلولہ سنّت کی نیت سے رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے، اصل یہ ہے کہ ــــــ

"ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین"، ص۱۸۱

مغز میٹھا نہ ہو تو بادام کی کیا تعریف

فرمایا ــــ بزرگانہ شکل وصورت سے کچھ نہیں ہوتا کوئی لفافہ ہی دیکھ کر تعریف کردے کہ خط بہت اچھا ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا جب تک خط کا مضمون نہ معلوم ہو اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی اس حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ "افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور وحصل ما فی الصدور"، کوئی بادام کا چکنا چکنا چھلکا اور بڑا سادانہ دیکھ کر تعریف کرے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں اصل تو گری ہے اور اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس سے روغن بادام کتنا نکلتا ہے اس مغز اور روغن کے ظہور کی جگہ تو قبر ہے اس وقت معلوم ہوگا کہ بادام کڑوا ہے یا میٹھا، تر ہے یا بالکل خشک، مولانا نے صحیح فرمایا ؎

آدمیت مشکل است اے آدمی — چوں بری روز آوری ہائے غمی
آدمیت لحم وشحم وپوست نیست — آدمیت جز رضائے دوست نیست
آدمیت گر بقوت می شدے — گاؤ خر از آدمی بہتر بدے

اسی لیے حدیث میں انما الاعمال بالخواتیم آتا ہے۔ ص۱۹۳

خلائی پروازیں انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ

دنیا نے غور کرنے ہی سے ترقی کی ہے۔ پہلے ہمارے یہاں میٹھے تیل کا چراغ جلتا تھا بارات میں مشعلیں لے کر لوگ چلتے تھے، دنیا نے اس پر اکتفا نہیں کی اور سوچتی اور تفکر کرتی رہی کہ اس سے آگے بھی روشنی ہونی چاہیئے یہاں تک کہ آج اس بجلی کی روشنی تک پہنچ گئی۔ ایمان اور دین کے بارے میں بھی اصول ہونا چاہیئے کہ جتنی روشنی ہمارے پاس ہے اس سے زیادہ کی طلب اور تلاش ہو کہ ترقی کی انتہا نہیں ہے اہل یورپ زمین سے جب ترقی کر چکے تو انھوں نے اب آسمانوں، سیاروں اور چاند کی طرف توجہ کی، میرے نزدیک یہ فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی سے کمالات حاصل ہوتے ہیں، دین کے نظر میں بھی یہی نظریہ ہونا چاہیئے۔ شاعر نے ٹھیک کہا ہے ؎

ترقی طلب کیجئے ہر گھڑی
خدا بے نہایت ہے رہ اس کی بڑی ص ۲۰۳

ہماری پستی کی انتہا

آج ہماری قوم اس پستی میں پہنچ گئی ہے کہ اسلام کا کوئی جوہر اس میں نہیں پایا جاتا نہ صداقت ہے نہ امانت، نہ اخلاق نہ عمل ہر قسم کی بداخلاقیاں اور جرائم ان میں مل جائیں گے، چور، دغاباز عیار، رہزن سب ملیں گے، نام عبدالرحمٰن، محمد سلطان وغیرہ وغیرہ۔ جذبات پر قابو پانا اور غصہ کو دبانا تو آتا ہی نہیں، دو شخصوں میں ذرا گفتگو ہوئی اور ایک نے دوسرے کو چاقو مار دیا، غصہ کا محل کیا ہے؟ اور خوشی کا محل کیا ہے؟ یہ جانتے ہی نہیں ساتھی پر تو غصہ آیا اور نفس کی شرارتوں پر کبھی غصہ نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم کو اپنی حقیقت معلوم نہیں۔ ص ۲۰۷

صحابہ کرامؓ کی اصل کرامت

مجھے رسالہ "بین الجبایۃ والھدایۃ" میں یہ پڑھ کر بڑا مزہ آیا کہ لوگ اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی بڑی کرامت یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا لشکر دریائے

دجلہ کو گھوڑوں پر بیٹھ کر عبور کر گیا اور نہ کوئی ڈوبا اور نہ کسی کی کوئی چیز ضائع ہوئی، لیکن فی الحقیقت اسلام کا بڑا معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی اصل کرامت یہ تھی کہ دولت کے دریا امنڈ آئے اور قیصر وکسریٰ کے خزانے ان کے قدموں سے لگ گئے وہ اس دریا میں سے ہو کر صاف نکل گئے اور ان کا دامن بھی تر نہ ہوا۔ ص۲۱۲

کلام کا صحیح مطلب متکلّم کی حالت اور محل کلام دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے

فرمایا۔ بے محل اگر فصیح و بلیغ الفاظ بولتے جائیں تو ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کسی نے ہمترانی سے کہا اے کناسہ تیری جاروب کشی نے میرا دماغ معطر کر دیا ہے، وہ بے چاری کچھ نہ سمجھی دوسرے نے کہا ہلکے ہاتھ سے جھاڑ گرد آرہی ہے۔ کسی نے دیہاتیوں سے پوچھا کہ آپ کے قریات میں امسال تقاطر امطار ہوا یا نہیں وہ کچھ نہ سمجھے ایک صاحب نے کہا کہ پوچھتے ہیں کہ چھینٹا پڑا یا نہیں تو وہ سمجھ گئے۔ ص۲۱۷

تین درجے

فرمایا۔ عبادت کے تین درجے ہیں پہلے عادت پھر عبادت پھر لذّت۔

جس دن قرآن نہ پڑھا جائے مزاج ٹھیک نہیں رہتا

ایک صاحب نے پوچھا حضرت مزاج کیسے ہیں؟ فرمایا الحمد للہ بہت اچھے ہیں اور اچھے ہی رہتے ہیں ہاں جس دن قرآن مجید نہ پڑھوں اس دن مزاج ٹھیک نہیں رہتا۔

"ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین"

سارا انحصار مزاج ہی پر ہے باقی رہا جسم تو چیز بگڑنے کے لیے ہے اس کا بگڑنا ہی اچھا ہے اس کے بگڑنے ہی میں بننا ہے شاعر بھی بعض مرتبہ عجیب عجیب باتیں کہہ جاتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے ؎

چلی تیزی نہ کچھ بادصبا کی
بگڑنے پہ بھی زلف اس کی بنا کی

عادات کو عبادت بنانے کی کوشش

فرمایا کہ عبادتوں میں چورن ملا ہوا ہے کھاتے جاؤ بھوک لگتی جاتی ہے اسی کا نام عبادت ہے جس سے طبیعت سیر ہوئی اس کا نام عبادت ہے دنیا کی ہر چیز کے کھانے کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی ہے مگر عبادت سے طبیعت سیر نہیں ہوتی سب بھائیوں نے اس کو تحفے دیئے میں نے اس کو نصیحت نامہ لکھ کر دیا یہی میرا تحفہ تھا۔ اس کا خاص مضمون یہی تھا کہ عادات کو عبادت بنانے کی کوشش کرو۔ عبادات کو عادت نہ بنالو، اس وقت ہماری اکثر عبادات عادت بن گئی ہیں جو عادتاً اور بغیر کسی شعور و استحضار کے ادا ہوتی ہیں کسی کو کلب جانے کی عادت ہے، کسی کو مسجد جانے کی، عبادات کی عظمت اور اس کی فضیلت کا استحضار نہیں ہوتا اجر و ثواب کے خیال اور اخروی منافع پر خیال کر کے کسی کام کو انجام دینے کا نام عبادت ہے یہی ترغیب و منافع ہیں جن کی وجہ سے آدمی سردی کی رات میں جب وہ میٹھی نیند سو رہا ہوتا ہے لحاف سے نکل کر نماز پڑھنے کے لیے اٹھتا ہے، ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا ہے، مسجد جاتا ہے اور یہی دنیاوی منافع کی خاطر کرتا ہے ڈاکیہ کی آواز پر کوئی عزیز سفر حج سے واپس آئے ہیں ان کے استقبال اور ملاقات کے لیے آرام چھوڑ کر اور تکلیف اٹھا کر جاتا ہے، مجھے تہجد کے لیے ان چیزوں سے کام لینے سے ہمیشہ اختلاف رہا، جو بیداری کے لیے معاون اور نیند دور کرنے والی ہیں اس کے لیے تو "ھل من سائل فاعطیہ ھل من مستغفر فاغفر لہ" کی وہ صدا ہی کافی ہے جو رات کے آخری حصہ (ثلث الیل الاخر) میں لگتی ہے اس صدا کے بعد پھر کسی اور تدبیر یا انتظام کی ضرورت نہیں۔[۲۷]

مظروف کا قصور نہیں ظرف کا قصور ہے

فرمایا سارا معاملہ کسی شے کی

عظمت وفضیلت کے یقین واستحضار کا ہے لوگ آتے ہیں اور بڑے شوق سے اپنے بچوں کو پیش کرتے ہیں کہ یہ حافظ ہو گئے ہیں ڈر جاتا ہوں کہ یہ اس دولت کی قدر بھی کر سکیں گے یا نہیں، بے شک دودھ بڑا خالص اور صاف وشفاف ہے لیکن یہ دیکھو کہ برتن بھی دھلا ہوا اور صاف وشفاف ہے یا نہیں، اگر برتن کثیف ہے تو وہ چیز بھی اس میں جا کر گندی نظر آئے گی۔

لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ تقویٰ اختیار کریں ہم کو ڈر ہوتا ہے کہ دین کو بدنام نہ کریں سارا انحصار قلب پر ہے۔

"ان فی ذٰلک لذکری لمن کان له قلب اواُلقیٰ السمع وھو شھید"

اختتام

آخر میں عرض ہے کہ فرمانِ الٰہی "وما ارسلنا من رسول الابلسان قومه" سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ہر نبی ورسول اپنی قوم وزمانے کی اعلیٰ ترین زبان کی نمائندگی کرتا ہے، آخری نبی امی صلے اللہ علیہ وسلم نے جب آسمانی دعوت وکلام اپنی قوم اور دنیا کے سامنے پیش کیا تو آپ کی دعوت کے انکار کے باوجود اس کے ادبی معیار وبلندی کو دشمنوں نے بھی تسلیم کیا، "والفضل ما شھد به الاعداء"، اور آج تک قرآن وحدیث کا ادبی معیار اور زبان کی بلاغت وفصاحت تسلیم ہی نہیں بلکہ وہ دونوں زبان وادب کا مستند مرجع مانے جاتے ہیں۔

اسی طرح ہر زمانہ وعلاقہ میں قرآن وحدیث کے چشمہ صافی سے سیراب ہو کر علماء ربانیین نے مصنف (تاریخ دعوت وعزیمت) کے الفاظ میں "ایمان ویقین، عشق ومحبت درد وسوز جذبہ اتباع سنت عزیمت، علو ہمت، ذوق دعوت وتبلیغ، اصلاح، اعمال و اخلاق اور صحیح علوم ودینی حکم ومعارف[1] کی اشاعت کا کام انجام دیا تو زبان بھی ایسی اعلیٰ

[1] مقدمہ تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۳ ص ۱۶

معیاری استعمال کہ کوئی بھی غیر جانب دار اس کو پڑھے گا تو اس کی فصاحت و بلاغت، برجستگی و شائستگی کو تسلیم ہی نہیں کرے گا بلکہ اس کی چاشنی و لذت دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے گا۔ کیونکہ وہ صرف زبانی جمع و خرچ اور لفاظی نہیں ہوتی بلکہ خون جگر سے رنگین "از دل خیزد بر دل ریزد" کا نمونہ ہوتی ہے اور ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت محمد یعقوب صاحب مجددیؒ کے انتقال پر بھوپال ہی کے جید عالم قاضی وجدی الحسینیؒ نے جو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا اس میں کہا تھا ؎

ان کی صحبت میں چمک اٹھتے تھے جلوے روح کے
نور قرآنی سے وہ بزم حسیں تابندہ تھی
تازہ تشبیہات سے معمور ہوتا تھا کلام
ان کے ہر بول پر روح ادب شرمندہ تھی

اور مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے فرمایا تھا ؎

ایک تھی بھوپال میں علم و یقیں کی بارگاہ
سب کو ملتی تھی جہاں سے پاکی قلب و نگاہ
بارگاہِ نور تھی وہ ایک عالی خانقاہ
خانقاہ دیں پناہ وہ جلوہ گاہ مہر و ماہ
جن کی صحبت سے تھا حاصل بیقراروں کو قرار
جن کی خدمت سے میسّر تھی حیاتِ نوبہار
جن کی ملفوظات سے ملتی تھی سب کو زندگی
بندگی، تابندگی، فرخندگی، رخشندگی

صاحب ملفوظات کی مزید تفصیلات کے لیے مطالعہ کیجیے۔

(۱) "صحبتے با اہلِ دل" مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

(۲) ماہنامہ "معارف" (جون ۱۹۷۰ء) اعظم گڑھ (یو۔پی)

(۳) ماہنامہ "الفرقان" (ربیع الاول ۱۹۷۰ء) لکھنؤ۔یوپی)

(۴) "نشانِ منزل" خاص نمبر (اگست ۱۹۷۰ء) بھوپال

(۵) پندرہ روزہ "تعمیرِ حیات" (مئی ۱۹۷۰ء) لکھنؤ

(۶) ہفتہ وار "صدقِ جدید" (۱۲ر جون ۱۹۷۰ء) لکھنؤ

(۷) "دعوت" (مئی ۱۹۷۰ء) دہلی

(۸) روزنامہ "ندیم" (مئی ۱۹۷۰ء) بھوپال

(۹) "الحمراء" روزنامہ (مئی ۱۹۷۰ء) بھوپال

(۱۰) "رہنمائے دکن" روزنامہ (مئی ۱۹۷۰ء) حیدرآباد

(۱۱) روزنامہ "دکن ہیرالڈ" (مئی ۱۹۷۰ء) بنگلور

جمشید احمد

ملفوظات سلیمانی

ملفوظات یوں تو ادب کی ایک خاص اصطلاح ہے جس سے بالعموم وہ کتب مراد لی جاتی ہیں جو کسی شیخ کی روحانی مجالس کی روداد پیش کرتی ہوں اور انھیں انہی مجالس کے کسی حاضر باش نے جمع کر دیا ہو، لیکن اگر اس کا دائرہ ذرا سا وسیع کر دیا جائے تو اس میں وہ کتب بھی شامل ہو سکتی ہیں جن کے بین السطور کسی شخصیت کے ملفوظات جا بجا بکھرے ہوئے ہوں جس کا تجربہ ہم درج ذیل صفحات میں پیش کر رہے ہیں کہ اس طرح کے تجربات سے ملفوظاتی ادب میں ایک نئی صنف کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

یہ ملفوظات ہم نے جناب غلام محمد کی کتاب "تذکرۂ سلیمان" اور پروفیسر سلیمان اشرف کی کتاب "سلوک سلیمانی" سے اخذ کیے ہیں ان کے علاوہ ان کی مختلف تصانیف سے بھی ان کے ملفوظات اکٹھا کیے جا سکتے ہیں:

علامہ سید سلیمان ندوی سی جامعیت بہت کم ہستیوں کو نصیب ہوتی ہے، انھوں نے علم کی جس وادی میں بھی قدم رکھا وہاں اپنی انفرادیت کے علم گاڑ دیئے، لہٰذا اواخر عمر میں جب اس شاہین علم و فن نے آستانہ تھانوی کو اپنا آشیاں بنا کر پر سمیٹ لیے تو ایک نئی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے جو ارشاد و سلوک کے منازل کو بہت تیزی سے طے کرنے کے بعد اپنے مریدین و متبعین کی رہبری کچھ اس طرح کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ان کی زبانِ مبارک نے نہ جانے کتنے ادب کے موتی لٹکائے ہوں گے جو افسوس ہے کہ جمع نہ کیے جا سکے

علامہ ندوی کے ملفوظات باقاعدہ طور پر مرتب نہیں کیے گئے جس کی بنیادی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ان کے وہاں عام مجلسوں کا رواج نہ تھا، بس کہیں کہیں خصوصی مجالس کے انعقاد کا ذکر ملتا ہے جن میں چند خصوصی احباب شامل ہوتے تھے جہاں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود ان کو قلمبند کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا جس کا اعتراف غلام محمد مرحوم نے بھی کیا ہے کہ "اب ان محفلوں کو یاد کر کے افسوس ہوتا ہے کہ ان کی روزانہ کی روداد کیوں نہ محفوظ کر لی گئی؟ اب اپنا حافظہ ایسا کہاں کہ اس کے بل بوتے پر یقین کے ساتھ وہ تفصیلات دہرائی جا سکیں"۔ دوسرا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا نے بالعموم اپنے مریدین کی رہنمائی خطوط کے ذریعہ فرمائی ہے جن میں ان سنگلاخ وادیوں کی مکمل تصویر کشی ملتی ہے کہ اگر ان خطوط کا جائزہ تصوف و سلوک کے حوالے سے از سر نو لیا جائے تو سلوک سلیمانی کا پورا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔ تیسرا سبب یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ مولانا بہت ہی کم آمیز و کم گو تھے، نتیجتاً ان کا حلقہ مجلس بہت زیادہ وسیع نہ ہو سکا لیکن موجودہ ملفوظات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب بھی ان کے لب وا ہوئے وہ الفاظ کو موتیوں کی شکل میں بکھیر دیتے تھے، کاش انھیں جمع کر دیا گیا ہوتا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حیات سلیمانی کے اوراقِ پریشاں سے بہت کم جگہوں پر بلکہ نہ ہونے کے برابر اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ عام مجالس کے انعقاد کا اہتمام فرماتے تھے لیکن اس کے باوجود ہمیں جن مجالس کا ثبوت ملتا ہے وہ اپنے تنوع کے لحاظ سے بہت منفرد اور پر لطف ہوا کرتی تھیں، جہاں مختلف موضوعات زیر بحث آیا کرتے تھے۔ جن کی جامعیت و رنگ کی تصویر کشی ایک حاضر باش نے یوں کی ہے۔ "ان مختلف محفلوں میں باتوں باتوں میں کتنی علمی گتھیاں سلجھ جاتی تھیں اور کتنے عارفانہ عقدے حل ہو جاتے تھے، تقدیر اور خیر و شر کے مسئلہ کی سلیس و تشفی بخش توجیہہ پہلی مرتبہ کانوں نے یہیں سنی، ذوق و شوق کا درجہ اور ان کی حیثیت کا صحیح ادراک یہیں سے حاصل ہوا، سنت میں شائستگی اور حسن سلیقہ کا جو اعلیٰ معیار موجود ہے اس کا درس بھی یہیں لطیف انداز میں ملا، وہی حاضر باش

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "بھوپال میں اور کراچی کے دوران قیام حضرت نے عصر و مغرب کا درمیانی وقت خاص طور پر تشنہ کاموں کے لیے وقف فرما رکھا تھا جو اپنی باطنی پیاس بجھانا چاہتے ہوں اور محبت و معرفت سے سرشار ہونا چاہتے ہوں۔

دستیاب شدہ ملفوظات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی مجالس کئی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھیں جہاں ان کی شخصیت کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے گہرا ہی نظر آتا ہے کہ وہ کبھی علمی و تفسیری نکات بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی ظرافت و مزاح سے مجلس قہقہہ زار میں تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی اپنے مریدین کو راہ سلوک و احسان کی دشوار گزار گھاٹیوں اور سخت مراحل کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کو بآسانی طے کرنے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، تو کبھی شعر و ادب کے دریا بہاتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں۔

علامہ ندوی کی گفتار بہت ہی دلکش و حسین ہوتی تھی جس میں ان کے لہجوں کی سادگی سلاست اور روانی کا امتزاج ایک خاص قسم کا حسن پیدا کر دیتا ہے جو ان کے ملفوظات کو دیگر لوگوں سے ممتاز و منفرد کر دیتا ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم نے موضوعات کے اعتبار سے ان کے چند جواہر ریزے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں، تاہم یہ بات یاد رہے کہ یہ ملفوظات باقاعدہ طور پر نقل نہیں کیے گئے ہیں، ان کو محض یادداشت کے سہارے مرتب کیا گیا ہے۔

علمی موشگافیاں

علامہ ندوی کی مجالس میں مختلف علمی مباحث زیر بحث آتے تھے۔ خصوصاً تفسیری نکات آپ بیان فرمایا کرتے تھے۔

"محبت کی دوگونہ کیفیت اس آیت سے بھی مفہوم ہے۔ قابل التوب، شدید العقاب، اللہ تعالیٰ سے رجا عمل کے ساتھ جمع ہوتی ہے، بغیر عمل رجا نفس کا فریب، شیطان کا دھوکہ

اور کبیدہ ہے، عمل کرتے ہوئے لرزاں و ترساں رہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو، والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے ان کی مہربانی اور محبت کی امید رکھنا حماقت ہے۔"

ایک مرتبہ تسبیحات فاطمہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا، "سبحان اللہ کا مطلب ہے کہ وہ تمام کمیوں سے بری اور پاک ہے، الحمدللہ کا مطلب ہے کہ تمام محبوبتیں اور خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے تو محبت سے جی چاہتا ہے کہ چمٹ جائے، لیکن آگے اللہ اکبر کہہ کر یہ بتایا گیا ہے وہ اتنی بڑی ذات ہے وہاں یہ بات ممکن نہیں ہے

پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و بخوبی سراپا ناز ہے

تصوّف و سلوک

علامہ ندوی نے تصوف و سلوک کی تعریف و حقیقت، اور اس کے مسائل بہت ہی مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیے جو صرف انھیں کا کمال قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

سلوک کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا، "شرعی علوم ظاہرہ اور یہ فن باہم کسی صورت میں متضاد نہیں کہ ثانی اولیٰ ہی کی اصلاح و تکمیل کا نام ہے۔

ایک مرتبہ سلوک کی خاص اصطلاح لطائف ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا، "تصوّف جو سراسر عمل تھا اسے فلسفہ بنا دیا، اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا۔"

ظرافت و مزاح

علامہ ندوی کی مجلسیں خشک نہ ہوا کرتی تھیں بلکہ ہمیں ان کے وہاں ظرافت و مزاح کا رنگ بھی نظر آتا ہے جو کہیں کہیں اتنا گہرا ہے کہ وہ مزاحیہ ادب کا شہ پارہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

علامہ ندوی پر ایک مرتبہ لقوہ کا ہلکا سا اثر ہو گیا تھا، ڈاکٹر جب انجکشن دے رہا تھا تو فرمایا، "ڈاکٹر صاحب انجکشن پٹھے کا ہے یا رگ کا؟ ڈاکٹر نے بتایا کہ انجکشن رگ کا نہیں پٹھے کا ہے

علامہ ندوی نے برجستہ فرمایا، "ڈاکٹر صاحب یہ پٹھے ٹھیک بھی ہوں گے یا یوں ہی الو کے پٹھے رہیں گے۔

ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک بلند شخصیت ان کی مہمان تھی ایک دن چہل قدمی کے دوران مہمان کی نظر ایک گدھے پر پڑی جو کمپاؤنڈ میں گھس آیا تھا، مہمان نے ازراہ مزاح میزبان پر طنز کیا کہ اچھا یہاں گدھے بھی رہتے ہیں، علامہ ندوی نے نہایت سادگی سے فرمایا "جی نہیں باہر سے آجاتے ہیں"۔

شعروادب

علامہ ندوی کبھی کبھی شعری قالب میں ملفوظات بیان کرتے ہیں تو کبھی اشعار سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے حضور میں کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت درد دل کس طرح حاصل ہو فرمایا:

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے وہ پہلے سوز سے سینہ تو داغدار کرے
ابھی شق فغاں کنج میں ہزار کر اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

ایک مرتبہ ڈاکٹر سلیمان اشرفؒ نے استفسار کیا کہ حضرت والا کیا کسی کا یہ کہنا صحیح ہے ؎

نگاہ مست ساقی نے مری دنیا بدل ڈالی

فرمایا جی ہاں، پسند ہے میرا بھی ایک شعر ہے ؎

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

سیاست میں سالکین و علماء کا انہماک پسند نہیں فرماتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ پاکستان کے ایک مشہور پیر کے متعلق فرمایا، پیر صاحب کو اب کس طرح ادھر (خالص دین کی خدمت کی طرف) لایا جائے وہ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سب کچھ سیاست میں ہے مذہب کچھ نہیں، منھ کو

خون لگ گیا ہے چٹخارہ ہے ع

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

ڈاکٹر سلیمان اشرفؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ ندوی کسی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے، معاً میرے دل میں خیال گزرا کاش حضرت کچھ ارشاد فرماتے، اس خیال کے گزرتے ہی مسکرا کر فرمایا، لوگ کہتے ہیں کچھ کہئے اور اکبر کہتے ہیں ع

تاثیر دکھا تقریر نہ کر

دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ ہمارا بنیادی نصب العین ہے اس کے لیے چند اصول و قواعد کی پیروی ضروری ہے۔ علامہ ندوی نے اپنے ملفوظات میں کچھ نادر اصول و قواعد بیان فرمائے ہیں۔

"لوگوں کو سختی سے دین کی طرف نہیں بلانا چاہیئے، انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا منشار شفقت تھی، لوگوں کو اپنی ہمدردی کا یقین دلائیے پھر پیار سے دین کی طرف بلائیے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

ایک مرتبہ فرمایا "دین کی خدمت کی راہیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اخلاص ہو اور سلف کی راہ سے سر مو تجاوز نہ ہو، گو قدیم جوہر کی بقا کے ساتھ جدید نقش و نگار سے پرہیز نہیں لیکن اگر یہ جدید نقش و نگار اصل قدیم جوہر کو فنا کر دے تو اس نقش و نگار سے بے نقش رہنا ہی اچھا ہے، فرماتے تھے "یہی اپنی وصیت ہے اور یہی زندگی کی آخری فرمائش"۔

عمومی ملفوظات

علامہ ندوی کے لب جب کبھی بھی وا ہوئے ان سے الفاظ موتیوں کی شکل میں یوں سامنے آئے ہیں گویا انھیں کسی ماہر فنکار نے لڑی میں پرو دیا ہو، چند نمونے ملاحظہ فرمائیے اور ان کے حسن بیان دل کشی اور جامعیت پر سر دھنیئے۔

- اللہ کا خوف سانپ بچھو کے خوف کی طرح نہیں ہے بلکہ محبوب کی ناراضگی کے خیال کی طرح ہے۔
- والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے ان کی مہربانی اور محبت کی امید رکھنا حماقت ہے۔
- حب مال و حب جاہ زہر کے دو لبالب پیالے ہیں جس کے منہ سے لگ گئے ہلاک ہو گیا۔
- سجدہ میں ایسا مزہ آتا ہے گویا بچہ نے اماں کی گود میں سر رکھ دیا ہو۔
- احساس نقص نقصان کی بات نہیں، احساس کمال نقصان کی بات ہے بلکہ احساس نقص تو ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔
- اگر وسوسہ کفر مضر نہیں تو وسوسہ گناہ کیسے برا ہو سکتا ہے۔
- سب کا جواب خاموشی ہے، آخر صبر کی تعلیم کس دن کے لیے ہے۔

یہ تھے چند نمونے جو ہم نے ملفوظات علامہ ندوی میں سے کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے اٹھا لیے ہیں ان کے علاوہ ان کی تصانیف سے ملفوظات کی ایک خاصی تعداد یکجا کی جا سکتی ہے علامہ ندوی کے یہ ملفوظات اگر زبان و ادب کے بہترین شہ پارے نہیں قرار دیے جا سکتے تب بھی اس کی ادبی اہمیت اور لطافت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، ان ملفوظات کا جائزہ لینے سے ان کی چند خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

- ٭ چھوٹے چھوٹے صاف و سادہ جملے مگر اپنے اندر علم و حکمت کا سمندر چھپائے ہوئے۔
- ٭ مخاطب کے ذہن کی رعایت اور اس کے معیار کے مطابق گفتگو۔
- ٭ ہر حال میں مخاطب کی دلنوازی اور اس کے ساتھ شفقت کا معاملہ۔
- ٭ ظرافت و مزاح۔
- ٭ سلاست و سادگی کے باوجود سوز و گداز لیے ہوئے۔

بقول غلام محمدؒ "عجیب کیفیت تھی کہ نہ گفتگو میں جوش تھا نہ لہجہ میں زور، مگر جو بات نکلتی تھی وہ دل میں اتر جاتی تھی۔"

اور یہی کسی کلام و گفتگو کے اعلیٰ معیار ہونے کا سب سے اعلیٰ پیمانہ ہے۔